

دن ڈھل رہا تھا۔ شام کے گلابی آنکھ کو دبیز کھر نے سرمئی رنگ دیے تھے۔ ڈھل جانے والے دن ابھرتی شب کا ملاپ یوں بھی دلوں کو نامعلوم سے احساس اندر دگی و اسی سے بوجھل کر ڈالتا ہے۔ اس کا دل پہلے ہی اس اجنبی جگہ و فضا کی اواسیوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

زندگی کے بائیس سال اس نے اپنے شہر میں گزارے تھے۔ شہر سے باہر جانے کا تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا اور اب اچانک وہ کراچی سے ایبٹ آباد آگئی تھی۔ پچھلے دو سالوں سے اس کی زندگی بے درپے بہت سے حادثات سے دوچار رہی تھی۔ جس میں نمایاں ترین ”حادثہ“ اس کی شادی تھی اور دوسرا حادثہ شادی کے دو ہفتے بعد وہ بھری پُری سسرال کو چھوڑ کر شوہر کے ساتھ ایبٹ آباد آگئی تھی۔

سبزے سے آراستہ چشموں و آبشاروں سے سجا قدرتی حسن سے مالا مال یہ شہر بھی باسط کے سنگار خراہوں و اٹل فیصلوں میں کوئی چمک پیدا نہ کر سکے تھے بلکہ کراچی میں بے جی بھیا بھابی اور ماں جی کے ادب میں بیڈروم سے باہر اس کا مزاج بہت اچھا ہوتا تھا۔ بچوں کو چھیڑتے وقت خود بھی ہنس پڑتا تھا اور یہاں آکر وہ مڑی سے بات کرنا ہی بھول گیا تھا بلکہ کبھی مخاطب بھی کرنا ہوتا تو بہت ہنک آمیز انداز ہوتا تھا۔ وہ خواہش کرتی اس سے بہتر ہے وہ اسے مخاطب ہی نہ کرے۔

اس نے رخ بستہ کھڑکی کے کشتے سے چہرہ نکا کر باہر دیکھا تھا۔ سرمئی و گلابی شام کا آنکھ پھسل کر سیاہ شب کی ردا بن گیا تھا۔ دھند اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ باہر تاحہ نگاہ دھواں ہی دھواں بکھر نظر آ رہا تھا۔ شیشہ برف کی سل کی مانند لگ رہا تھا جس سے نکا چہرہ بے حد ٹھنڈک کے احساس سے لمحے بھر میں سن ہونے لگا تھا۔ سردی کی تیز لہر اس کے وجود میں سرایت کر کے ریزہ کی ہڈی میں سنناٹا مٹ پیدا کر رہی تھی اور اس کے احساس و اعصاب پر تکلیف سوار ہونے لگی تھی..... مگر وہ بے حس و حرکت یوں ہی کھڑی رہی خود کو اذیت دینا اس کو اچھا لگنے لگا تھا۔ دن بھر میں ایسے کئی مشاغل تھے اس کے جن کی حد تک پہنچ کر اسے محسوس ہوتا کہ اب بس وہ لمحوں میں ان کانٹوں بھری زندگی سے چھٹکارا پالے گی۔ اس طرح خود بھی شاید سکون پالے گی اور باسط کو بھی اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہی تو اس کی دلی مراد تھی لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ عین وقت پر موت خود اسے زندگی کی جانب دھکیل دیتی تھی۔ موت بھی شاید اسے پسند نہ کرتی تھی۔ باسط کی طرح وہ بھی اس کے لیے ناقابل برداشت و قبول تھی۔

شیشے سے چہرہ نکائے وہ تہیہ کیے کھڑی تھی۔ آج آخری سانس تک وہ یہاں سے نہیں ہٹے گی۔ شیشہ اتنا بخ ہوتا جا رہا تھا کو یا باہر کی تمام کمر بریلی ہوائیں اس میں محسوس ہو گئی ہوں۔ رواں رواں سردی کی شدت سے کاپٹے لگا تھا۔ رگ و جاں میں سنناٹا مٹ بڑھنے لگی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے درود شریف و کلمہ طیبہ کا زیر لب ورد کرنے لگی۔

”تبدیر! اگر زندگی سے اتنی ہی پیز ار دتی ہو تو شادی سے قبل ہی کیوں نہ مر گئیں؟ اب مگر مجھے بھنسا لانا چاہتی ہو۔“ اس نے ایک جھٹکے سے پردہ ابر کیا تھا پھر جس طرح وہ بے آواز کمرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح چلا گیا تھا۔

وریشاٹل ہوتے احساسات کے ساتھ اپنی ناکامی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر وہ نا کام ہوئی تھی۔

”مرنا آسان نہیں ہے۔ موت اتنی آسانی سے نہیں آجاتی۔“ اس نے کڑھ کر سوچا۔ پھر اسی لمحے اندر سے ایک صدا ابھری ”مرنا آسان نہیں ہے۔ موت آسانی سے نہیں آتی تو عاقب کس طرح آنا فنا زندہ سے مردہ میں تبدیل ہو گیا؟“

وہ مضطرب سی کھڑی ہو گئی۔ آہ و فغاں کا طوفان اس کے اندر بھرنے لگا۔ ”عاقب! چچا جان! چچی اور دادی جان ایک سال کے اندر ادھر تمام زمین کی آغوش میں جا سوئے تھے۔ وہ اب مجھے لوگ تھے نیک تھے۔ تب ہی ان کے لیے آسانی تھی اور میں.....“

”کس کا سوگ منا رہی ہو..... میں زندہ ہوں ابھی۔“ وہ بٹی کی چال چلنے والا شخص بگڑے تیور و خست لہجے میں کہتا اندر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

”وہ..... میں.....“

”کیا میں خاموش۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے درشتگی سے کو یا ہوا۔ اس کے انداز میں برہمی تھی۔

”گھر سے فون آنے والا ہے۔ ان سے اچھی فریٹ آواز میں بات کرنا۔ انہیں ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ کل ہی سب پہنچ جائیں گے میری گردن مارنے کے لیے اور ابھی میں کسی سے بھی کوئی تعلق نبھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔“ اس نے اپنے مخصوص ہنک آمیز انداز میں کہا۔

وریشاٹل سے بدل کر آئی تو اسی وقت فون کی بیل بج اٹھی تھی جو باسط نے ریسو کیا۔ رمی دعا سلام کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اسی وقت اس کے پرسکون و متکلف لہجے سے کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے مہذب و نرم و ملائم لہجے میں کسی کے لیے نفرتوں کے اژدھے پھنکارتے ہیں۔ تذلیل و تضحیک کی بارش کی جاتی ہے۔

”پترا کیسی ہو؟“ باسط نے ریسو اسے پکڑا دیا تھا۔ دوسری جانب سے بے جی کی پر شققت آواز پھر اس کے دل کو گداز کرنے لگی مگر وہ کسی مستعد چوکیدار کی طرح اس کے قریب کھڑا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بے جی! آپ سائیں کیسی ہیں؟“

”میں ٹھیک نہیں ہوں پترا بلکہ کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”اوہ! کیا ہوا بے جی! سب خیریت تو ہے نا؟“

”ٹو ہم سب کا دل اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ پترا بہت یاد آتی ہے تیری۔ تیرے ساتھ گزارے پندرہ دن پندرہ صدیوں کی طرح لگتے ہیں۔“ بے جی کے لہجے میں اس کے لیے ستائش و فخر تھا۔ آواز بخوبی قریب کھڑے باسط تک بھی پہنچ رہی تھی۔

”ہم سب بہت شکر کرتے ہیں اپنے رب کا اس نے ہمیں ایسی ہی بہودی جیسی ہم چاہتے تھے۔“ بے جی کی پُر شکر آواز پر باسط کے چہرے کے ہر زاویے سے بے انتہا کبیدگی و نا پسندیدگی واضح ہونے لگی تھی۔ بے جی کے بعد ماں جی بھیا بچوں نے بات کی وہ سب ہی اس کی محبت کے گرویدہ تھے اسے یاد کرتے تھے۔ باسط کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ یہ سب اس کی خواہش کے برخلاف تھا۔ بھابی سے بات کیے بنا بھی وہ دھپ دھپ کرنا وہاں سے چلا گیا۔

”تم ٹھیک ہونا وریشا؟“ بھابی کے انداز میں نظر تھا۔

”جی بھابی جان! مجھے کیا ہونا ہے..... بڑی سخت جان ہوں۔“

”گد تہیں سخت ہونا بھی چاہیے۔“ جو باسط کو بھی کھلکھلائی تھی۔ ”باسط کمرے میں نہیں ہے؟“ ان کے انداز میں یکجہت سنجیدگی در آئی۔

”نہیں۔ وہ بیڈروم میں ہوں گے۔“

”منزہ مارشس سے واپس آگئی ہے۔ کچھ دنوں قبل اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب وہ یقیناً باسط سے رابطہ کرے گی یا شاید پہلے ہی کر چکی ہو تو اس کا بھرپور سہ نہیں ہے۔“ ان کی آواز میں مضطرب و تشویش تھی۔ وہ خاموش رہی۔

”باسط پر نگاہ رکھنا جلد از جلد اس پر اپنی محبت کی گرفت مضبوط کر ڈالنی چاہت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑو کہ وہ منزہ کی طرف دیکھنے کی بھی سعی نہ کر سکے۔“ بھابی اسے کافی دیر تک مفید مشوروں سے نوازتی اور سمجھاتی رہی تھیں۔

سسرال کے معاملے میں وہ بہت خوش نصیب تھی۔ بزرگوں سے بچوں تک اسے پیار و محبت حاصل تھا۔ فخر و اعتماد حاصل تھا۔

سسرال کے برعکس معاملہ باسط کے رویے کا جس کے نام کے ساتھ منسلک ہو کر وہ سسرال آئی تھی۔ اس نے اسے پہلی شب ہی ٹھکرایا تھا۔ بے وقعت و بے حیثیت کر ڈالا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوتی۔ دروازہ کھلا پر فوم کے محور کن چھوٹکوں کے ساتھ بلیک تھری پیس سوٹ میں نکھر نکھر انک سک سے تیار وہ سامنے کھڑا تھا۔

”بھابی سے اتنی دیر کیا باتیں ہوئیں؟“ کو یا یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ساتتیں یہیں تھیں۔

”وہ خیریت دریافت کر رہی تھی۔“ اس نے سر جھکائے جواب دیا۔ وریشا کے انداز میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اسے چونکا تی۔

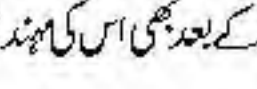
”میں جا رہا ہوں۔ گیٹ لاک کرلو۔“ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار گھر سے باہر نکل رہا تھا ورنہ آفس سے آنے کے بعد کچھ وقت وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے گزارتا پھر سونے تک کمپیوٹر کے کی بورڈ اور ماؤس پر اس کی انگلیاں متحرک رہتی تھیں۔

”منزہ آگئی ہے شاید باسط سے اس نے رابطہ کر لیا ہو۔“ بھابی کی سرکوشی اس کے کانوں میں گونجی پھر اس کی یہ تک سک سے تیاری اور غلاف معمولی روانگی گیٹ پکڑے ہاتھ لمحے بھر کو لرزش کا شکار ہوئے تھے۔ باسط باہر نکلتے ہوئے رک کر کو یا ہوا۔

”انتظار مت کرنا۔“ وہ رکا نہیں سیدھا چلا گیا۔

وہ گیٹ لاک کر کے کتنی دیر تک اس سے ٹپک لگائے کھڑی رہی۔ ”انتظار مت کرنا۔“ یہ جملے کسی مرد کے لیے کہہ دیئے کتنے آسان ہیں جب کہ عورت کا دوسرا نام ہی صبر و استقلال و انتظار ہے۔

رات پوری طرح ماحول پر چھا رہی تھی۔ سردی کی شدت میں بھی پوری طرح اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بیڈروم میں چلی آئی جہاں باسط بیڑاں کر گیا تھا۔ ماحول میں فرحت آمیز حرارت در آئی تھی۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ عشاء کی نماز کا وضو بنانے کے لیے اس نے آستین فولد کیں۔ سفید ہاتھوں پر سرخ مہندی کے دلکش نقش و نگار رنگ ایسا ہی تھا کو یا آج ہی مہندی رچائی ہو۔ انہیں یہاں آئے دو ہفتوں سے زائد ہو گئے تھے۔ آنے سے چند گھنٹے قبل بھابی نے زبردستی مہندی لگائی تھی۔ ان کے خیال میں نئی ٹیوٹوں پر مہندی سے ہی طہنا پاتا ہے۔ دو ہفتے گزار جانے کے بعد بھی اس کی مہندی معمولی سی پھیک نہ پڑی تھی۔ مہندی پر جی اس کی اواس آنکھوں میں ماضی کی جھللا مٹا بھری تھی۔



”میں نے اور وریشا نے ساتھ مہندی لگائی تھی۔ میری مہندی کب کی دھل دھلا کر صاف ہو گئی اور اس کی مہندی ابھی تک ایسی ہی ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے اس کی مہندی کارنگ بھی بڑا گہرا آتا ہے۔“ رمضہ اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے رشک آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ قریب بیٹھی وادی جان نے کہا۔

”ایسی لڑکی کو سسرال بہت محبت کرنے والا ملتا ہے اور خاندان کسی پروانے کی مانند ٹارہتا ہے اس پر۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بندہ پہلے ہی دیوانہ ہے بعد میں پروانہ بھی بن جائے گا۔“ قریب سے گزرتے ہوئے عاقب نے سرکش سے کہا۔
 لمحے بھر میں وہ اس سرد موسم میں پسینے سے شرابور ہو گئی۔ مہندی کے وہ گل بوئے زہریلے کیڑے مکوڑوں کی طرح ڈسنے لگے تھے۔



گھر سے فون آیا تھا۔ رگنی دعا کے بعد امی اور ابو کا بے حد صراحت تھا کہ وہ اسے گھر بلانا چاہتے ہیں۔ تین ماہ وہ چکے ہیں اسے ایٹ آباد آئے ہوئے۔ وہ اس کو دیکھنے کو ملنے کو بے چین ہیں۔ بھائی بھابی ایسا اور آپلی سب کی خواہش یکساں تھی مگر وہ رخصت ہوتے وقت اس گھر سے یہ عہد کر کے نکلی تھی۔ انہیں اپنی جدائی کی سزا دے گی۔ باسط کی جانب کا بہانہ کر کے اس نے معذرت کر لی تھی۔ گفتگو کے دوران اسے محسوس نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کی طرح خاموش چال چلنے والا شخص کب بیڈروم سے نکل کر وہاں آن کھڑا تھا۔
 ”میکے سے اتنی بیزاری..... اور تمہیں یہ خوش فہمی کب سے ہو گئی کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا“ میرا گھر تمہاری ذات کا مرہون منت ہے۔“ بلیو جینز‘ وائٹ شرٹ پر میروں ہائی ٹیک پہنے سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کے قریب کھڑا تھا۔ خوب صورت سیاہ بھنورا آنکھوں میں کچھ ہفتوں میں بہت روشنیاں سی جگمگانے لگیں مگر اس کے لیے مختار و حقیر و متسخر تھا۔

”بے جی نے کہا تھا مجھے آپ کا ہر دم خیال رکھنا ہے۔“ اس نے نگاہیں جھکا کر کہا تھا۔

”ہا..... بے جی کہیں گی تو سانس لینا بھی چھوڑ دو گی؟“ وہ پلٹر یہ مسکرایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ لوچا کر کے بغور دیکھنے لگا۔ وہ اس کے ہاتھ کی حدت سے سر تا پا کانپ اٹھی تھی۔ جھکی ہوئی سیاہ دراز پلکیں اس کے رخساروں پر لرزنے لگیں۔

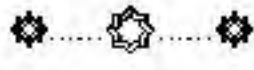
”بے جی نے حقیقت میں چاند زمین پر تلاش کر لیا ہے مگر فوس‘ تم میرا مقدر نہیں ہو۔“ وہ اس کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میرے نصیب کا چاند کوئی اور ہے جس کے پیار کی کرنوں سے میرے دل کے افق پر ہر سوچا ندنی نکھری رہتی ہے جو میرے جسم میں سانسوں کی طرح سموی رہتی ہے۔“
 اس کی بھاری آواز میں ایک دلکشی تھی جو جیسے جیسے اسے پر جو دکھو الما رسائی و ہجر کی گہری بنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ وہ اب غائب رہتی تھی وہ خوش رہنے لگا تھا۔
 غیظ و غضب‘ پلٹر و حقیر‘ بے اعتنائی و لاپرواہی صرف اس کے لیے تھی۔

”چھوڑو ان ریاضتوں کو کچھ حاصل نہ کر پاؤ گی۔ میری منزل تم نہیں ہو۔ میری منزل کوئی اور ہے۔“ وہ اس کا چہرہ چھوڑ کر دوں ہو گیا۔ پھر ٹیبل سے کار کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔
 ”کوئی اور کی گردان کیوں باسط صاحب! صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ کے نصیب کا چاند منہ ہے اور شاید وہی آپ کا مقدر بھی ہے۔“
 وہ سوچتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ باہر سردی میں ٹھنڈا ہوا موسم اس کا تھا۔ پہاڑوں کی بلندی پر دھوپ کی زرد کرنیں سونا نکھیر رہی تھیں۔
 وہاں اتنا حسن و دلکشی موجود تھی جو نگاہوں کو سکون بخشی تھی لیکن اس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ وہ جب گھر کے سناٹے سے روح کی وحشتوں سے گھبرا کر بولکھلا جاتی تو لاؤنچ کی کھڑکی میں آن کھڑی ہوتی اور شیشے سے چہرہ دکائے باہر ان نظاروں کو نگاتی رہتی جو اسے اپنی طرح ہی اس وقت دکھائی دیتے تھے۔ وہ باہر دیکھتے ہوئے ایک دم چونکی تھی۔ دور سے بڑے کے درمیان ناگن کی طرح تل کھاتی سڑک پر آف وائٹ کار دوڑتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ وہ کار باسط کی تھی۔ وہ گھر سے نکلتا تو گھنٹوں سے پہلے واپسی نہ ہوتی تھی اور اب ایک گھنٹے سے قبل اس کی واپسی نے اسے چونکا دیا تھا۔ تیز رفتار میں دوڑتی ہوئی کار لمحوں میں گیٹ کے پاس آ کر رگ گئی۔ ڈرائیونگ ڈور کھول کر باسط باہر نکلا پھر جھک کر فرنٹ سیٹ کی طرف کسی سے مخاطب ہوا تھا۔

وریشا کے دل نے دھڑک کر منہ کا نام پکارا تھا کیونکہ کار کی فرنٹ سائیڈ پھولوں کی باڑ سے چھپ گئی تھی۔ صرف باسط نظر آرہا تھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر جو الوہی چمک تھی۔ لیوں پر دلشیں مسکان و آنکھوں میں روشن چاہت کی مشعلوں سے نکلتی روشنی پتہ دے رہی تھی۔ من چاہا سکتی ساتھ ہے۔ شاید وہ اس سے صراحت کر رہا تھا کہ وہ گھر میں چلے اور شاید وہاں سے کوئی عذر مانع تھا۔ چند سیکنڈ زہر اس کے بعد وہ باہر آ گیا تھا۔ وریشا پردے کی بوٹ میں ہو گئی۔ لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو وہ پھرتی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ باسط بڑی عجلت میں اندر آیا تھا اور اس کی جانب دیکھے بنائی بیڈروم میں چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ بڑے نوٹوں کی گلدیاں جیکٹ کی جیبوں میں ڈالتا ہوا جس عجلت میں آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

وریشا پر اس نے اچھٹی سی نگاہ بھی نہ ڈالی تھی کویا گھر میں موجود بے جان اشیاء اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ تندرل و بے وقعتی کی اس سے بڑھ کر کوئی حد ہو سکتی ہے؟ وہ روز اس کی بد مزاجی و سردہری کے زخموں سے گھائل ہوتی تھی مگر ابھی کی نظر اندازی اسے کندھری سے ذبح کر گئی تھی۔ آنکھیں فوراً ہی احساس زبیاں سے بھر آئی تھیں نہ معلوم کس جذبے کے تحت اس نے پردے کی اوٹ سے جھانکا تھا۔ باسط کارٹن کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرشاری تھی۔ اس کے کاندھے پر رکھا سفید ہاتھ خرطومی انگلیوں میں دھکی گلوٹھیاں اور سیاہ ساڑھی کا پلو اس کے شک کو یقین دے گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دل کٹ کر اشکوں میں بہنے لگا۔



”تم میکے کیوں نہیں جاتیں؟ عجیب ہو میرے دوستوں کی بیویاں روز پچے گھروں کے پکڑ لگاتی ہیں۔ ایک تم ہو کبھی بھول کر بھی جانے کا نام نہیں لیتی ہو۔“ ناشتہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص دل چلانے والے انداز میں کویا ہوا تھا۔ ”میں تمہیں خرید کر نہیں لایا ہوں۔ بھی میکے جاؤ۔“ جگ سے جوس نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔
 ”منہ آگئی ہے۔ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔“ وہ جوس پیتے ہوئے وریشا سے کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بہت گہرائی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں ہمیشہ کی طرح ایک سکوت و بے حسی طاری تھی۔

”وہ بہت پریشان ہو گئی ہے۔ بہت دکھی رہنے لگی ہے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔“ اس کی کھوج تھی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر کسی ملال کا عکس‘ حسد کا رنگ‘ کسی پریشانی و فکّر کو دیکھنے میں نا کام رہی تھیں جیسے وہ کسی اور کی بات کر رہا ہو۔ اس کی مردانہ لانا کو اس کی یہ خاموشی و بے حسی تجسس آمیز اضطراب میں مبتلا کرتی تھی۔
 شادی کی پہلی شب کو جب اس نے سخت انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ اس کی نہیں بے جی (دادی) کی پسند ہے۔ ان کی خواہش پر ہی گھر میں آئی ہے۔ اس سے اس کا ایسا کوئی تعلق نہ ہوگا جس کی آرزو وہ رکھتی ہے۔ اس کی پسند اور محبت منہ ہے اور منہ ہی رہے گی۔ وہ چاہے جب اس سے طلاق لے سکتی ہے۔“ وہ سمجھ رہا تھا دلہن بنی وہ لڑکی جو خوب صورت ارمانوں و پلے سپنوں کی بیچ پر بیٹھی ہے۔ اپنے روپ کو سراہے جانے پیار و محبت کی مدھ بھری باتوں کی بجائے رویے جانے ٹھکرائے جانے پر کیا کچھ نہ بول دیا کرے گی رُوئے گی چلائے گی..... اس سے جواب مانگے گی کہ جب وہ کسی اور کو پسند کرنا تھا کسی من چاہے وجود کی چاہ تھی تو اس کی زندگی کیوں خراب کی؟ کیوں اپنا نام دے کر لایا.....؟
 وہ منتظر تھا۔

اس کی آہو بکا کا دباؤ یوں و صلو اتوں کا..... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے بیڈ سے اتر کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی جب سے آج تک وہ اس کی طرف سے منتظر رہا تھا اور ہر بار اس کی خاموشی و لاتعلقی اسے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتی کہ ایسی اعصاب شکن باتوں پر کوئی رد عمل کیوں نہیں کرتی۔ مرد محبت کرے نہ کرے مگر بیوی اس کے ساتھ کسی دوسری عورت کا نام بھی سننا کو ارا نہیں کرتی ہے۔ ایک وہ تھی جس کو کوئی پروا نہ تھی۔ اس کی بیلا پرواہی اسے سوچنے پر مجبور کرتی کہ کہیں وہ بھی کسی اور کو پسند تو نہیں کرتی ہے؟ یہ احساس ہی ایسا زہریلا پھنکارتا ہوا ناگ تھا جو اسے ڈستار بنتا تھا اور وہ نہ چاہنے کے باوجود اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

”میں منہ سے شادی کر رہا ہوں۔“ اپنے ارادے سے آگاہ کرتے وقت وہ پوری طرح اس کے احساسات کی زد میں اس کی ٹوٹی کھوں کے حصار میں تھی۔
 ”میں نے کب منع کیا ہے.....“ سب کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ بہک گیا تھا۔ خون کی ننھی ننھی بوندیں شفاف ہتھیلی پر نمودار ہوئی تھیں جن کو کمال مہارت سے اپنے جذبات کی طرح اس نے چھپا لیا تھا۔ سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔

”ابھی یہ کام میں پرائیوٹی میں کرنا چاہتا ہوں۔ امید کرتا ہوں گھر تک تم خبر نہیں پہنچاؤ گی۔“ اس بار اس کی زبان ساتھ نہ دے سکی۔ صرف گردن اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔

باسط کے ذہن میں پھر شک کے ناگ سرسرا نے لگے۔ وہ ادھورا ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ وریشا نے اس کے آفس جانے تک صبر ضبط سے کام لیا۔ ٹیبل صاف کی‘ کچن سمیٹا‘ برتن دھوئے پھر اس کے جانے تک وہ ڈسٹنگ سے بھی فارغ ہو چکی تھی۔

باسط کی موجودگی میں اندر ہی اندر گرنے والے آنسو تھاپی پاتے ہی بے قراری سے باہر نکل آئے تھے۔ جنہیں اس نے روکنے کی سعی نہ کی اور وہ خاموشی سے بیٹھی روتی رہی۔ اول روز سے وہ جانتی تھی۔ باسط اس کا نہیں ہے پھر اس کی بے اعتنائی و بے نیازی نے بھی یہ حقیقت کبھی بھولنے نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود اندر کسی کوششے میں ایک موہوم سی آس کا دیا جل رہا تھا۔ کبھی نہ کبھی پلٹ آنے کا۔ آج وہ دیا بجھ گیا تھا۔ کبھی نہ بٹنے کے لیے۔ وہ روروی تھی۔ بڑی شدتوں سے ہچکیوں سے روئے جاری تھی اور ذہن میں دادی جان کی فکر انگیز آوازیں گونج رہی تھیں۔

”بہو! جب یہ اس طرح ہنسنے سے باز نہیں آتی تو اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا کرو۔ میرا دل ہول جاتا ہے جب یہ اس طرح ہنستی ہے۔“ وہ اسے کھلکھلا کر ہنستا ہوا دیکھ کر اس کی امی سے مخاطب ہوئیں جو قریب بیٹھی تھیں۔

”اماں! یہ نیک کام آپ ہی کریں مجھے میں طاقت نہیں ہے۔“ جو اب وہ کچھ فاصلے پر بیٹھی وریشا کو گھور کر بولیں جو رمحہ کے ساتھ بیٹھی کوئی بات سناتے ہوئے بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ اس کی عادت تھی بات بے بات قہقہے لگانے کی۔ بات ہنسی کی نہ بھی ہو تو وہ ہنستی تھی اور اگر ہنسی کی بات ہو تو پھر اس کی ہنسی کسی بریک فیل گاڑی کی طرح بمشکل قابو میں آتی تھی اور ایسے میں دادی جان کا پارہ ہائی ہو جاتا تھا۔

”ارے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے لڑکی! اس طرح منہ پھاڑ کر مت ہنسا کر۔ دل مردہ ہو جاتا ہے اور چہرہ بے رونق پھنکار رہتی ہے کہیں بعد میں ایسے ہی رونا نہ پڑ جائے۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر خدشے بیان کرتیں۔ چچی جان لپٹا کر کہتیں۔

”میری وریشا کے نصیب تو سب سے بلند ہیں۔“

”یہ تمہاری محبت ہے صابرہ! جو تم اس لڑکی کو ہو بنا رہی ہو ورنہ اس لڑکی میں سوائے خوب صورتی کے کوئی گن نہیں ہیں۔“ امی دیورانی سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بھابی! جب سر پر پڑتی ہے سب کام آجاتا ہے جب ذمے داریاں پڑیں گی یہ لالہ بالی پن وکھنڈرا پن سب کم ہو جائے گا پھر یاد کریں گے۔“ ماضی کے دروازے اکثر وا رہتے ہیں جہاں سے یادوں کے جھونکے اپنے گزر جانے کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگی۔ سامنے آویزاں آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو داوی کی باتیں درست لگی تھیں۔ پھولوں کی طرح دلکش چہرہ اور ستاروں کی مانند جھمکاتی آنکھیں مانند پڑ گئی تھیں۔

گلابوں سی رنگت زردیوں میں ڈھل گئی تھی۔ امی اور داوی کی ڈانٹ پھنکار کے باوجود بے تحاشا کپڑے لانے کی عادی تھی ہر نئے فیشن کی ابتدا ہوتا تھا جس کی ذات کا مرکز ہوتی تھی۔ داوی کہتیں۔

”ابھی سے ایسا پہنے اوڑھے گی تو شادی کے بعد کیا کرے گی؟“

”آج آپ دیکھ رہی ہیں داوی جان! یقیناً ناخبر ہوں گی۔ آپ کی یہ مکھی والی لائق کام چور اور پھوہڑ پوتی جس کو ہنسنے، قہقہے لگانے اور بے تحاشا بولنے کی عادت تھی جو گھومنے پھرنے میں خوش تھی۔ کسی انارکلی کی طرح اس شیشے و ماربل کے بنے گھر میں جن دی گئی ہے۔ اس پر وہ تمام دفعیں لاگو ہیں جو کسی خطرناک و ناقابل معافی مجرم کے لیے ہوتی ہیں۔ آج میرے رب ٹی سے نا آشنا ہیں اور زبان گفتگو سے محروم۔ ہیر اسٹائل بدلنا بھول گئی ہوں۔ میرے بال جو کبھی شانوں سے بھی اونچے تھے۔ آج کمر سے بھی نیچے ہیں۔ مدت ہوئی میں نے ان کو قینچی لگانا چھوڑ دی۔ آپ کو اعتراض تھا میں دن میں کئی سوٹ بدل ڈالتی ہوں اب ہفتے میں دو بار بدلتی ہوں۔ اکثر ایک سے بھی کام چلا لیتی ہوں۔ چار بیڈرومز لاؤنچ، سنگ رم اور ہال پر مشتمل اس کانچ کی میں خود صفائی کرتی ہوں۔ مکن کی تمام ذمے داری میری ہے۔ میرے پکائے کھانوں پر باسط نے کبھی تنقید نہیں کی۔ نہ میں کہیں جاتی ہوں اور نہ کوئی میرے پاس آتا ہے۔ یہاں کا بچر خاصے فاصلوں پر ہیں۔ داوی جان یہ سب میرے لیے آپ کی پوچھن کو نیاں تھیں یا بددعا میں؟“ وہ کہتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”آپ مجھے بددعا میں نہیں دے سکتیں داوی جان۔ عاقب کے بعد آپ مجھ سے بھی محبت زیادہ کرتی تھیں۔“



اس کو اطلاع دینے کے بعد وہ بالکل ہی آزاد ہو گیا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ موہا بل سے چکارہتا تھا۔ وہ بیڈ کی سائیڈ میں آنکھیں بند کیے ان کی گفتگو سنا کرتی۔ باسط دوسری طرف سے آنے والی پر جوش و جذباتی باتوں پر ہوں ہاں میں جواب دیا کرتا تھا۔ نہ معلوم وہ اس کی موجودگی کے خیال سے جھجکتا تھا یا وہ اپنے جذبات کے اظہار کی قیل از وقت تشہیر پسند نہیں کرتا تھا مگر دوسری جانب ایسی کوئی قید نہ تھی۔ باسط کی غیر موجودگی میں وہ گھر چلی آئی۔

”آپ کی تعریف؟“ وریشا نے گیٹ کھولا تو وہ بتا کچھ کہے بڑے طعمرق سے اندر چلی آئی تھی۔

”ہماری تعریف.....“ اس نے سر تا پا وریشا کو دیکھتے ہوئے مغرورانہ لہجے میں کہا پھر اٹھلا کر بولی۔

”لوگ کرتے ہیں لیکن پھر بھی بتا دیتی ہوں۔ میں اس گھر کی اصلی مالک ہوں منہ۔“ ریڈ سا ڈھی جس پر سلور ورک بھللا رہا تھا۔ ویسی ہی جیولری میں اس کے بھرے بھرے نقوش والا چہرہ۔ ریڈ لپ اسٹک سے رنگین ہونٹ دلکش لگ رہے تھے۔

وہ دلربا حسن کی مالک تھی۔

”بیٹھے پلیز۔“ لمبے بھر میں اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”یہ میرا گھر ہے۔ یہاں رہنے کی فیضی کی اجازت تم سے لینے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔“ سا ڈھی کے پلو کو بائیں ہاتھ سے دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے وہ رعب دار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کی حاسدانہ نگاہیں وریشا پر تھیں۔ اسی اثنا میں باسط اندر داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”منہ! تم..... یہاں؟“

”ہاں ڈرائنگ! میں نے سوچا تمہیں سر پر آرزوؤں۔“ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور بڑے استحقاق سے اس کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی اس حرکت پر وہ بری طرح شیشا گیا۔ بے ساختہ نگاہ سامنے کھڑی وریشا پر اٹھی تھی جو خود انگلیوں کھڑوتی ہوئی زروس لگ رہی تھی۔

”اوکے بیٹھو۔“ بہت نرمی سے اس کے بازو گلے سے نکالتے ہوئے وہ مخاطب ہوا پھر مائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

”کھانا لگا دوں؟“ کوگلوں کی کیفیت میں کھڑی وریشا کے لبوں سے آواز نکلی۔ ان دونوں کے درمیان کھڑے رہنا اسے بہت دشوار لگ رہا تھا۔

”ہاں۔“ باسط نے دھیمے سے کہا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں آگئی۔ لٹچ میں چکن چلیز منہز پلاؤ بنایا تھا۔ سویٹ ڈش میں فروش ٹرائٹل تھا۔ سلاد اور رائتہ سب تیار تھا۔ تمام ڈشز اس نے ڈائنگ ٹیبل پر سجادی تھیں۔ باسط کو اطلاع دے کر وہ پھلکے بنانے لگی۔ وہ کھانے میں مگن تھے۔ دونوں میں سے ایک نے بھی اسے دعوت نہ دی تھی۔ گرم پھلکے پہنچانے جب وہ جاتی تو بڑے محکم پھرے انداز میں آرڈر ملتا۔

”گلاس میں پانی بھرو۔ وہ ڈش اٹھا کر دینا۔ یہ روٹی کے کنارے کچے ہیں۔ ڈھنگ سے پکانا نہیں آتا۔ پلاؤ میں مرچیں تیز ہیں منہز بھی پوری طرح نہیں گلے۔ اس سے اچھا لوٹو سٹی کھانا میرا بگڑنا ہے۔“

کھانے کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتے ہوئے وہ ہر عیب جوئی میں مشغول تھی۔ باسط کو کیا کان اور زبان گروی رکھے بیٹھا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کی فرمائش ہوئی پھر چائے کی۔ وہ سر جھکائے ایک کے بعد ایک حکم کی تعمیل کرتی گئی۔ لاؤنج میں ان کے قہقہے باتیں ہر سو کوخ رہی تھیں۔ شام میں وہ باسط کے ہمراہ چلی گئی۔ صبر و برداشت کی پہلی انتہا تھی۔ اس کے بعد اس نے معمول بنالیا۔ ہر دوسرے دن وہ موجود ہوتی۔ گھر کی ہر شے سے لے کر باسط پر پھر پور حق جتاتی ہوئی۔ وریشا کی خاموشی نے اس کے حوصلوں کو تقویت دی تھی جو وہ اس کو کچھ گردانتی نہ تھی۔ البتہ باسط اب اس کی روز روز کی آمد اور پھر وریشا کی درگت پر کنفیوڈنظر آنے لگا تھا۔ وریشا کو انگلی کے اشاروں پر متحرک رکھتی تھی پھر اس کے حوالے سے نظر کرنا باسط کو زروس کر رہا تھا۔ اب اس کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ اس کے ساتھ گھر میں زیادہ وقت نہ گزارے۔

اس دن وہ آم لے کر آیا جو خوب صورت بیکنگ میں تھے اور آم دیکھتے ہی اس کے ذہن میں عاقب کی یاد اس انداز میں آئی کہ وہ دم بخود ہی کھڑی رہ گئی۔

”تمہارے لیے باغ کے سارے آم لے آیا ہوں۔ کھاؤ کتنے کھاؤ گی۔“ وہ بچ مچ کی پیٹیاں آم کار کی ڈگی میں بھر کر لے آیا تھا۔

”بچ عاقب! تم کتنے اچھے ہو۔“ اس نے بیٹی سے آم نکال کر دوپٹے سے صاف کیا اور کھانے لگی۔

”لا حول ولا قوۃ۔ سست لڑکی دھوٹ لیتیں اس کو۔“

”صاف کیا تو ہے دوپٹے سے۔“

”اللہ حافظ ہے ہمارے معدوں کا۔ تم کھانا بھی اسی طرح پکاؤ گی۔“

”ہاں۔ اگر معدوں کا اتنا ہی خیال ہے تو ملازم رکھ لینا۔“

”یہ بات داوی جان کے آگے مت کہہ دینا۔“

”اتنی بدھونٹیں ہوں میں۔“

”اتنی نہیں ہو پر ہوضرور۔“ اس نے شرارت سے چھیڑا۔

”عاقب! وہ غصے سے بولی۔

”جی جان عاقب!“ اس کے انداز میں محبت کے تمام رنگ تھے۔

”ایسی باتیں مت کیا کرو ورنہ..... میں تمہاری جان لے لوں گی۔“

”ضرور ضرور..... یہ جان تمہارے لیے ہے جان من۔“ اس نے چڑ کر آم اور گٹھلی دور اچھالی اور آگے بڑھنے لگی۔

”ماراض مت ہو یا ر! میں نقد کر رہا تھا..... رکو..... سنو تو سہی آم لینے گیا تو ایک لطیفہ ہو گیا۔“ وہ رک گئی۔

”کیا ہوا؟“ انداز میں مصنوعی ناراضگی تھی۔

”میں نے ایک آم والے سے پوچھا۔“ خان صاحب! میں یہ سارے آم خرید رہا ہوں۔ انہیں بیک کر دو۔“

”جھوٹے یہ کوئی لطیفہ ہے؟“

”پوری بات تو سنو۔ میری بات سن کر خان غصے سے بولے تھیں ہم سارا مال تم کو نہیں بیچے گا۔ میں نے کہا خان صاحب! میں منہ مانگے دام خرید رہا ہوں تو وہ بولا۔ تم مارا بات کا مطلب سمجھا نہیں۔ اگر ہم سارا مال تم کو بیچ دے گا تو سارا دن کیا بیچے گا؟“ اس کی ٹی کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ عاقب مسکراتا ہوا اسے بے تحاشہ ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آم کا ڈبا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

”کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو.....؟“ باسط نے بڑھ کر اسے تھاما تھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بیک کر اس کی گرفت سے نکلی تھی۔

”آم تمہیں پسند نہیں ہیں۔“ باسط نے ڈبا اٹھا کر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ میں اس کی خوشبو سے بھی چڑتی ہوں۔“ عاقب کی وفات کے بعد اسے اس پھل سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

”آم کا موسم نہیں ہے آپ کو کہاں سے مل گئے؟“ وہ بلا ضرورت بات کر کے اپنی جھینپ کو منار ہی تھی کیونکہ اس کے اس چونکا دینے والے لطر زعمل سے باسط الجھ گیا تھا۔ اس کی ذہین آنکھیں اسی انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس کا ماضی جاننا چاہ رہی ہوں عجیب کھونج تھی۔

”آؤٹ آف میزن میں بھی مل جاتا ہے۔ انسان فورڈ کر سکتا ہو.....“ وہ آم کا بیک شدہ ڈبا اٹھا کر چوکیدار کو دے آیا تھا۔

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت اداس تھی کیونکہ آج عاقب کی سالگرہ منائی جاتی تھی۔ سارا دن وہ غمزدہ رہی تھی۔ چائے اور سلاکس کے علاوہ کچھ نہ کھایا تھا۔ آج خلاف

توقع سارا دن باسط گھر میں ہی رہا تھا اور اسے معلوم بھی نہ ہوسکا تھا کہ وہ ہر لمحہ اس کی پر تجسس نگاہوں کے حصار میں رہی تھی۔ رات خواب میں بھی اسے عاقب ہی نظر آ رہا تھا۔ شادی کا گھر تھا۔ بارگاہ کی تیاری عروج پر تھی۔ امر بھائی دولہا بننے کا ریس بیٹھنا چاہتے تھے مگر چالی اوپر ان کے کمرے میں رہ گئی تھی۔ وقت کے پابند نایا جان کا غصہ عروج پر تھا۔ امر بھائی کے دوست اور دوسرے شستے دار آتش بازی کے علاوہ فائرنگ کر رہے تھے کہ آج کل ان فضولیات کے بغیر خوشیاں اڑھوری کبھی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی سب ہو رہا تھا۔ وہ اوپر جا رہا تھا۔ وریشا نیچے اتر رہی تھی۔ اس وقت اس کی سچ دھج نرالی تھی۔ ڈارک پر پل شرارہ سوٹ پر کولڈن فینسی کام تھا۔ ہمرنگ جیولری نورمہارت سے کیے گئے میک اپ میں اس کا نوخیز حسن دو آنھ نظر آ رہا تھا۔

”اوہ..... چشم بد دور..... لگتا ہے سارا میک اپ تم پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن کے لیے کچھ میک اپ بچایا بھی ہے یا نہیں.....؟“ وہ اسے پر شوق نظروں سے دیکھنے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے تعریف کرنے کا؟ سیدھے تعریف نہیں کر سکتے تھے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”اوپر سے چابی لے کر آ جاؤں پھر دل کھول کر تعریف کروں گا۔“ نایا جان کے غصے کا خیال آتے ہی کہتا ہوا اوپر کی جانب دوڑا تھا۔

”چابی اوپر سے ہی پھینک دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہی جائیں گے۔“

”میرے پاس نام نہیں ہے فالٹو لوگوں کو لے جانے کا۔ اگر تم تنہا چلتی ہو تو ٹھیک ہے۔“ وہ ہنستا ہوا کہہ رہا تھا۔

”تمہارے ساتھ میں تنہا جاؤں گی۔ منہ دھو رکھو۔“

”سوچ لو..... ورنہ ساری زندگی یاد کرو گی۔“ اس کے شوخ لہجے میں ایسا کوئی احساس ضرور تھا جس نے لمحے بھر میں وریشا کو سہا دیا تھا پھر وہ شانے جھٹکتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔

”رکویا رامیں چابی دے کر آ رہا ہوں۔“ وہ اسے رکنے کا اشارہ کر کے بھاگتا ہوا اوپر گیا تھا۔ امر کے کمرے سے چابی لے کر میسر سے نیچے جھک کر امر سے چھوٹے عامر کی طرف اچھالی تھی اور وہ پیچھے ہٹ ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ کوئی سیدھی اس کی پیشانی میں گھتی چلی گئی۔

لمحے بھر کو سماں ختم گیا۔

وقت کی گردشیں رک گئیں۔

پھر بہت سارے منظر کیے بعد دیگرے بدلتے گئے۔ خون سے لت پت وجود کفن میں لپٹا اس کا زرد چہرہ اگر بتی وکانو کی خوشبو گلاب کے پھول..... آہیں سسکیاں آنسو.....

وہ چٹنی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا؟“ باسط اس پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”عا..... قب..... عاقب۔“ سانس اس کی دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ خوابیدگی کی کیفیت میں پکار رہی تھی۔ باسط نے سیمپ روشن کر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ باسط نے اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

براؤن سلکی گیسو نیچے پر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ لائٹ بلسوٹ میں اس کے خوب صورت چہرے کی زردی نمایاں تھی۔ سیاہ پلکیں شبنمی قطروں سے تر تھیں۔ وہ خواب کی کیفیت میں جس طرح مدھوشی سے اٹھی تھی اسی بے خبری سے سو رہی تھی۔ وہ جھکا ہوا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اس کے دل کی حالت زیر و زبر تھی۔

اس کے شکوک کو یقین کی غیاہل گئی تھی۔

وہ ساری رات ایک ہی فترے کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا تھا۔

عاقب.....

عاقب.....

”عاقب! کون ہے یہ عاقب؟“ وہ ساری رات جاگتا رہا سوچتا رہا۔ حسد و رقابت کی آگ اس کے پور پور میں سلگنے لگی تھی۔



بے جی کا فون آیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ ایک چکر کراچی کا لگائیں۔ چھ ماہ ہو چکے ہیں انہیں ان سے دور ہوئے۔ ماں جی تو باقاعدہ باسط سے ناراضگی کا اظہار کر رہی تھیں۔ بھیا بھائی کی بیابھر ہی تاکید تھی کہ وہ جلد سے جلد آئیں۔ وریشا کو وہ ابھی بھی منزہ سے بچنے کی ترغیب دینا نہ بھولی تھیں۔ وہ باسط سے منزہ کے مسلسل رابطے و تعلق سے بے خبر تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا وہ ماں بیٹی ایبٹ آباد میں مقیم ہیں اور ان کی منشا پر ہی باسط نے اپنا سفر ایبٹ آباد کر دیا تھا اور وہ جلد از جلد شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وہ سب ان باتوں سے بے خبر سمجھ رہے تھے کہ وہ وریشا کی محبت میں بھول گیا ہے۔ اس کے لیے حسین ترین لڑکی کا انتخاب کرنے کا مقصد یہی تھا کیونکہ زہر زہر کو مانتا ہے اور حسن حسن کو..... ان کو اس خوش فہمی اور طہینان میں مبتلا کرنے والی وریشا تھی جس نے اصل حقائق چھپا کر انہیں اپنی اور باسط کی جھوٹی داستانیں سنائی تھیں اور انہیں فکر و اضطراب سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سب کی فکریں اور تکلیفیں اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی۔ اپنے بدلے کی خوشیاں و راتیں دوسروں میں بانٹ دینے والی۔ گداز دل حساس طبیعت لڑکی۔

”یہ کچن کے سامان کی لسٹ ہے۔“ وہ ہر نکل رہا تھا جب اس نے لسٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایسی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میرے کوئی گھر داری کی تھی۔ اب وہ چھٹیوں پر ہے۔“ اس نے وضاحت دی تھی۔

”لیکن..... سامان ختم ہو چکا ہے سارا ڈنر میں بنانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں فکر مندی تھی۔

”میرے پاس نام نہیں ہے۔ ابھی جیولر کے پاس جانا ہے۔ رات میں ہوٹل سے لے آؤں گا۔ کل میرے ساتھ چلی جانا شاپنگ کرنے۔“ وہ عجلت میں کہتا ہوا ہر نکل گیا۔ وریشا دروازہ بند کر کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سنک میں پڑے ناشتے کے برتن دھوتے ہوئے اس کا ذہن باسط کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

بچھلے چند دنوں سے اس کا رویہ ناقابل فہم سا ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی بالکل خاموش ہو جاتا۔ کئی کئی دنوں تک اس کی سنجیدگی و بے زاری عروج پر رہتی۔ وہ اس سے اتنا بیزار واکھڑا کھڑا رہتا کہ زندگی تنگ پڑنے لگتی یا پھر اس کی نگاہیں عجیب انداز میں اپنے ارد گرد محسوس کرتی جیسے وہ کچھ کھون رہا ہو تلاش رہا ہو کوئی بے چینی کوئی سوال اکثر اس کے لبوں کے گوشوں پر پھڑ پھڑا کر رہا جاتا تھا جس کو وہ کسی مصلحت کے تحت لبوں سے ادا نہ کر پاتا تھا۔

نہ معلوم اسے کیا پریشانی تھی..... کیا مسئلہ درپیش تھا جس نے اس کی راتوں کی نیندیں بھی اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اس نامعلوم اضطراب میں وہ اپنی محبت اپنے جنوں کو بھی بعض اوقات نظر انداز کر دیتا تھا۔ راتوں کو آنے والی منزہ کا لڑرہی سونہ کرنا بلکہ سیل فون ہی آف کر دیتا تھا جب سے آکر اس نے وریشا کو تنگ کرنا شروع کیا تھا تب سے باسط نے اس سے باہر ہی ملنا جاری رکھا تھا۔ وہ گھر کی خواہش ظاہر بھی کرتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک دیا کرتا تھا۔

چھ ماہ کے عرصے میں پہلی بار اس نے اسے باہر لے جانے کی بات کی تھی۔ لہجہ بھی خاصا مہربان و نرم تھا۔ کبھی کبھی ہی وہ اس انداز میں بات کرنے کا عادی تھا۔ آج وہ جیولر کے پاس جانے کا کہہ رہا تھا شاید اس کی شادی کی ڈیٹ قریب ہی تھی۔ وہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی برتن دھونے کے بعد سنک دھو رہی تھی جب وہ وہاں داخل ہوا۔

”میرے خیال میں آج ہم شاپنگ کر لیتے ہیں جیولر کے پاس میں کل چلا جاؤں گا۔“ اس کی استعجابی نظروں کے جواب میں وہ کہہ رہا تھا۔

موسم ملکی خنکی لیے ہوئے تھا۔

بازار میں کھلی دکانوں کے درود یواروں پر ہلکی دھوپ کھڑی تھی۔ سورج کی کرنوں کی گرمائی اس ٹھنڈے ماحول میں سرور انگیز تھی۔ رائل بلو گرم سوٹ پر رنگین دھاکوں و شیشوں سے دیدہ زیب کام تھا۔ اس کی ہمرنگ چادر اوڑھے وہ سادہ چہرے کے باوجود بہت دلکش و منفرد نظر آ رہی تھی۔ باسط کی بے ساختہ نگاہیں کئی بار اس کے چادر کے ہالے میں لپٹے باوقار و پاکیزہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

”حسن بے حجاب متاثر کن ہوتا ہے یا حجاب میں رہ کر سحر انگیز؟“

سامان کی خریداری میں باسط نے خاصی مدد کروائی۔ اس دوران کھانے کا وقت ہوا تو وہ اسے ایک ہوٹل میں لے کر چلا آیا۔ انہوں نے وہاں نہ صرف کھانا کھایا بلکہ وہ ڈنر کے لیے بھی کھانا پیک کروا کر لے آیا تھا۔

”وریشا۔ وریشا۔“ وہ ہوٹل سے نکل کر کار کی طرف بڑھ رہی تھی جب اس کے کانوں میں شناسا آواز گونجی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

”وریشا! ٹھیک گاڈیم ہی ہو۔ تمہیں کیا ہوا؟ تمہارا رنگ روپ تم کس کے ساتھ آئی ہو؟“ رمضہ وہیں اس سے پت گئی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑی حیرانگی سے اس سے سوالات کرتی چلی گئی۔ مل ادا کر کے آتا ہوا باسط انہیں ملتے دیکھ کر رک گیا تھا۔

”اپنے شوہر کے ساتھ۔“ باسط کی طرف رمضہ کی پشت تھی۔ باسط بہت غور سے وریشا کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر اس لڑکی کو دیکھ کر مسرت و فخر کے سائے لرزاں تھے۔ آنکھوں میں عجیب سا خوف اتر آیا تھا۔ وہ بھی باسط کو دیکھ چکی تھی اور تعارف کروانا ہی چاہتی تھی کہ وہ ہڑے پر جوش انداز میں کہہ دیتی۔

”مبارک ہو مائی ڈیز! عاقب بھائی سے تو مجھے ڈبل ٹرپ لینی ہوگی۔ کہاں ہیں عاقب بھائی؟“ وہ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھومی تھی۔

”عاقب بھائی۔“ لیکن سامنے کھڑے خوب روپیہ ڈنم اجنبی شخص کو دیکھ کر اس کے مسکراتے لب یک دم بھنج گئے۔ آنکھیں حیرت سے ابل پڑی تھیں۔

”یہ باسط کامران ہیں میرے شوہر۔ یہ رمضہ ہے میری کلاس فیلو اور میسٹ فرینڈ۔ شادی کے بعد کنیڈا چلی گئی تھی۔“ بہت بردباری و تحمل سے وریشا نے دونوں کا تعارف کرایا تھا۔ رمضہ کا دھوواں چہرہ متغیر ہوتی رنگت اس کے دل پر گزرتی قیامت کی عکاسی تھی۔ خود اس کے اندر بھی بھیا تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ بول اس طرح سر راہ رمضہ سے ملاقات دوسرا جس طرح عاقب کا نام لے کر اس کا پکارنا۔ باسط کو دیکھ کر رری ایکٹ کرنا۔ وہ عاقب کے اس دکھ کو بھول گئی تھی جو رمضہ کو دیکھ کر اسے سرنو پیدا ہوا تھا مگر

رمضہ کی بدحواسی و بکھلاہٹ نے جو باسط کی نگاہوں میں شک و اشتعال کے تاثر پیدا کیے تھے وہ اس کی حساس طبیعت سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔ وہ ہری طرح سہم گئی تھی۔ باسط نے بمشکل اپنی پھرتی لٹا کے جنون کو قابو کیا تھا۔ اپنے بدترین خدشوں کا ابھی اسے پکا ثبوت مل گیا تھا۔ یہ احساس ہی اس کے لیے سوہان روح تھا کہ وہ معصوم حسن رکھنے والی، کلیوں کی طرح پاکیزہ و شفاف نظر آنے والی لڑکی کا کردار اس کی طرح شفاف نہ تھا۔ اس کی زندگی میں اس سے قبل بھی مرد رہا ہے اور یہی احساس اسے چھلنی کرنے لگا۔ بیٹوں کی اندرونی حالت ایک جیسی ہی تھی۔ بیٹوں ہی شکا کڈتے مگر وضع داری و اخلاقیات کا پرچم بلند کیے ہونٹوں پر جبرائیل مسکراہٹ سجائے مگر کلمات ادا ہوئے تھے۔ باسط نے اسے گھرا لیا تھا۔

”آپ مجھے انوائٹ نہ بھی کرتے تو میں آجاتی کیونکہ میں صرف کل تک ہوں یہاں پرسوں لاہور چلی جاؤں گی۔“ رمضہ اس سے لیڈریس سمجھنے کے بعد چلی گئی تھی۔ ان دونوں کی واپسی کا سفر بہت کٹھن و دشوار تھا۔ آتے میں جس چہرے کو وہ چوری چوری دیکھتا رہا تھا اب جاتے میں ایک نظر اس پر ڈالنے کا خواہاں نہ تھا اور بیشا بھی دم سادے بیٹھی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو شام ڈھلنے والی تھی۔ فضا میں کھربڑھنے لگی تھی۔ باسط کا موڈ ہری طرح بگڑا ہوا تھا۔ چونکہ اراکو اس نے ہدایت دیدی تھی کہ کوئی بھی آئے اسے باہر سے ہی لوٹا دیا جائے۔ سیل فون بھی آف کر دیا تھا۔ اس وقت اسے منظرہ کی صورت دیکھنے کا آواز سننے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

رات میں اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بھوک و ریشا کو بھی نہ لگی تھی۔ ماحول میں عجیب سی وحشت و پرہول سکوت پھیل گیا تھا۔ باسط وہاں سے آنے کے بعد کمرے میں بند تھا۔ وریشا سے اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ کھانے کا پوچھنے لگی تو بڑے سخت لہجے میں انکار کیا تھا۔ وہ خاموشی سے چلی آئی۔ دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اول روز سے ہی وہ اس کے مزاج دکھتی آئی تھی۔ اس کے غصے و ناپسندیدگی کی زد میں رہی تھی مگر آج اس کا مزاج و اشتعال سب سے سوا تھا۔

ساری رات کو یا کانٹوں پر بسر ہوئی تھی۔ وریشا نے بیڈ پر کروٹیں بدلتے روتے ہوئے گزاری تو وہ اس پر فلی سردی میں کبل و جیکٹ سے بے نیاز میسر پر ٹپکتا رہا تھا۔ نہ معلوم کون سی ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی جس نے اسے رکوں میں جمانے والی سردی سے بے نیاز رکھا تھا۔ شاید حسد و رقابت کی آگ جلن ہر آگ سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

وہ بیڈروم میں نہیں آیا تھا اور صبح ناشتہ کیے بغیر ہی آفس چلا گیا تھا۔ وریشا اس کی خاموشی سے ہری طرح ڈسٹرب ہوئی تھی۔ ذہنی دباؤ اور رات بھر جاگنے کے باعث اس کے سر میں درد ہوتا رہا۔ طبیعت پر کسٹمندی ہی ہو گئی تھی۔ وہ چائے پی کر پکانے کی تیاریوں میں لگی تھی کیونکہ آج رمضہ کو آنا تھا اور اسے یقین تھا وہ یہاں آنے میں زیادہ تاخیر نہیں لے گی کیونکہ اس کی شادی کے بعد اس کے والدین اپنے بیٹے کے پاس جدہ چلے گئے تھے۔ گھر فروخت کر کے پھر رمضہ سے بھی چند ماہ تک رابطہ رہا تھا جو کون کون سی مصروفیات کی وجہ سے کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی بہترین دوست تھی۔ ایک ہی محلے میں رہنے کے باعث عاقب سے بھی ملاقات رہتی تھی۔ ان کے درمیان ہونے والی اکثر لڑائیوں میں وہی ثالثی کا رول ادا کرتی تھی۔

وہ ابھی چکن دھور ہی تھی جب وہ ڈرائیور کے ہمراہ آئی تھی۔ ہاتھ میں تازہ پھولوں کا بڑا سا باو کے ایک اور گفٹس پکڑے تھے۔

”تمہارے شوہر کہاں ہیں؟“ مگر سلام دعا کے بعد وہ استفسار کرنے لگی۔ اس کے انداز میں بے چینی و مضطرب تھا۔ وہ بہت سادہ چلبے میں آئی تھی۔ کل جیسی شوخی و سرت اس کے لہجے سے مفقود تھی۔

”آفس گئے ہیں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آفس؟ آج سنڈے ہے۔“

”اوہ۔ میرے ذہن سے نکل گیا۔ ویسے وہ گھر میں نہیں ہیں۔“

”وریشا! کل سے اب تک میں نے وقت کانٹوں پر بسر کیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تمہیں کبھی عاقب بھائی کے ساتھ۔ نہیں کسی اور کے ساتھ دیکھوں گی۔ کیا ہوا؟ کس وجہ سے تم اور وہ ایک نہ ہو سکے؟ تمہارے درمیان وہ عام روایتی سماج بھی نہ تھا جو ہمارے معاشرے میں عموماً ہوتا ہے۔ دادی چچا، چچی سب تمہیں بے حد چاہتے تھے اور عاقب کی دیوانگی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ خود سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے تمہارا۔ شاید ہی کسی نے کسی سے اتنی محبت کی ہو مثنیٰ وہم سے کرتے تھے پھر ایسا کیا ہوا؟ کس سنگ دل نے تم دونوں کو جدا کر دیا؟“ وہ ایک سانس میں بولی گئی۔

”موت نے۔“ اسے اپنی آواز خود کسی گھر سے کون سے آتی محسوس ہوئی۔

”واٹ..... یہ..... یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ صدمے و بے یقینی کی انتہا پر تھی۔ وریشا کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گرنے لگے۔

”عاقب..... بھائی..... کی ڈسٹنہ..... مگر کس طرح؟ کافی دیر بعد وہ اس شاک سے سنبھلی تو شدتوں سے رو پڑی تھی۔ وریشا خود کو سنبھال چکی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا یہ سب کیسے ہوا؟“ رمضہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اگر بھائی کی شادی والے دن۔ بارات کے جاتے وقت وہ ان کی کار کی چابی لینے ان کے کمرے میں گیا تھا۔ چابی نیچے اچھال کر وہ ہٹ ہی رہا تھا کہ اتر بھائی کے دوست جو ان کی شادی کی خوشی میں فارنگ کر رہے تھے۔ ان کے ریا اور سے نکلی کسی کوئی کا وہ حکار ہو گیا تھا۔“ پرانے زمنوں کے مٹائے پھر سے کھل گئے تھے۔ ہر زخم ہر تکلیف تازہ ہو گئی تھی۔ اس کے قریب بیٹھی رمضہ رو رہی تھی۔ عاقب کو یاد کر رہی تھی۔

وہ اس کے حق سے محروم کر دی گئی تھی۔ عاقب جو کبھی سب کچھ تھا۔ اب کچھ نہ رہا تھا۔ اس کی سانس کے ساتھ سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کبھی نہ جڑنے کے لیے۔ عاقب کی یاد کو اس نے اپنے دل سے کھرچ کر پھینکنے کی سعی کی تھی کیونکہ وہ اب کس لڑکی نہ رہی تھی۔ ایک عزت دار گھرانے کی، ہونیک، باعزت و با وفا شخص کی بیوی تھی اور بیوی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے مجازی خدا کے گھر میں بیٹھ کر اپنے سابقہ سنگیتر کی یاد میں آنسو بہائے۔ آنسوؤں پر اختیار کب رہتا ہے؟ یادوں پر پہرے کون بیٹھا سکتا ہے مگر عزت کی حرمت و وفا کا پاس یہی تھا کہ دل پر پتھر رکھ لیا کرتی تھی۔ آنکھوں کو نم ہونے نہ دیتی۔ خواہ دل میں رم، مہم ہوتی رہے۔ اس وقت بھی وہ خود سے ہر داؤ نہ ماتی۔

”عاقب کے بعد چچا دادی اور چچی بھی دنیا چھوڑ گئے۔ ایک سال کے اندر بچا کی فیملی خاک تلے جا سوئی۔ سب ختم ہو گیا۔“ اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ رمضہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

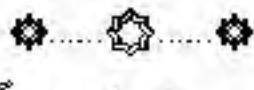
”تمہارا حوصلہ تمہارا صبر تمہاری ہر داشت دیکھ کر میں دنگ رہ گئی ہوں وریشا تم بالکل بدل گئی ہو۔ اتنی تنجید گئی تمہارے اندر آگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے ہنسنا تو کیا تم مسکنا بھی بھول چکی ہو۔ دادی جان کو کتنی چہشتی نا تمہارے ہنسنے سے۔ اگر آج وہ ہم میں ہوتیں تو کتنیں وریشا تم ہنسا کر دم ہنسی اچھی لگتی ہو۔“ رمضہ پر ہنوز رقت طاری تھی۔

”میرا دل مردہ ہو گیا ہے۔ دادی جان ٹھیک کہتی تھیں۔ زیادہ ہنسنے سے چہرہ بے رونق ہو جاتا ہے۔ پھلکار برسنے لگتی ہے جو بہت ہنسنا ہے۔ وہ بہت روتا بھی ہے۔“ خاصی دیر وہ عہد رنت کو یاد کرتی رہی تھی۔ اس دوران رمضہ نے صرف کافی پی تھی۔ ایسے اندوہناک حقائق نے اس کی بھوک پیاس اڑا کر رکھ دی تھی۔ وریشا کی ہر ممکن کوشش کے باوجود اس نے اسے دعوت کا کوئی اہتمام نہ کرنے دیا تھا۔ وہ باتوں سے سیر ہونا چاہتی تھی۔

”وریشا! باسط بھائی کیسے ہیں؟ شخصیت ان کی گڈ لکنگ ہے مگر تمہارے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے؟ کیا وہ یہ سب جانتے ہیں؟ تم خوش ہو؟“ حسب عادت اس نے کئی سوال پے در پے کر ڈالے تھے۔

”بہت کینرنگ ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں۔ عاقب کے بارے میں میں نے ان کو نہیں بتایا۔ تم بتاؤ کیا بتانا چاہیے؟“ وہ کل رات سے باسط کا رویہ دیکھ کر دل میں ابھرنے والے سوال کی بابت پوچھ بیٹھی۔

”نہیں ہرگز نہیں..... بھول کر بھی یہ بے وفائی مت کرنا۔ مرد خود کہیں بھی گل کھلاتے پھر ہیں۔ شادی کے بعد بھی دوسری عورتوں کے چکروں میں رہیں۔ دوسری تیسری شادیاں کریں۔ یہ سب اپنے لیے جائز و حلال سمجھتے ہیں مگر خود سے وابستہ ہونے والی عورت کو اتنا پاک و صاف سمجھیں گے کہ اس کے خوابوں میں بھی کسی مرد کا تصور نہ آیا ہو نہ وہ فانی ذہنیت کے ہوتے ہیں۔ تمہارا اور عاقب بھائی کا رشتہ کتنا پاکیزہ و مقدس تھا۔ تم جانتی ہو یا ہم اگر انہیں بتاؤ گی تو اچھا نہ ہوگا۔“ رمضہ لہجے کے لیے نہیں ٹھہری تھی۔ اس کو لاہور جانا تھا۔ وہاں چند دن رک کر راجی جہاں سے اس کی واپسی کینیڈا تھی۔ بڑی اداس و لول ہی وہ واپس گئی تھی۔



صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ باسط گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی فکر سے حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اس طرح کبھی نہیں گیا تھا۔ اگر جانا بھی تھا تو گھر پر کچھ وقت گزار کر جاتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جارہی تھیں۔ سو سے اس کے ذہن کا گھبراؤ کر کے چین و قرار لوٹ رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کس سے اس کا معلوم کرے۔ وہ کسی سے بھی واقف نہیں تھی۔ اس نے یہ اختیار بھی کب دیا تھا۔

رات کے تار یک سائے دھرتی پر پوری طرح سایہ لگن ہو گئے۔ وہ نہیں آیا۔ وہ دل پکڑ کر بیٹھتی چلی گئی۔ باسط کی جھانپیں بے اعتنائی و بے رخی سب اس پشت چلی گئیں۔ اب اسے یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ اس کا مجازی خدا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر سکھ ہر دکھ اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ اسے اپنی تڑپ و بے چینی پر حیرت تھی۔

وہ اس شخص کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔ اس شخص کے لیے فکر مند تھی جس نے پہلی شب ہی اس کی آرزوؤں و خواہشوں کو بے رحمی سے اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا اور بہت سفاکی سے اس کی ذات کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ من مانی کرنا رہا تھا۔ اس کی موجودگی پر وہ کپے بنا منظرہ سے آزادانہ میل جول نیل پر رومنس بھری ہر شب رومنس بھری گفتگو کرنا۔ وقتی طور پر اسے بدظن کر دیا تھا مگر ان لمحوں میں اس پر انکشاف ہوا تھا کہ نکاح کے مقدس تین لفظوں میں کیسی طاقت و قوت ہوتی ہے جو عورت کو پرانے تعلق بھلا کر اس تعلق کا ہیضہ کے لیے اسیر کر دیتی ہے۔ دل کے فریم سے عاقب کی تصویر نہ معلوم کب محو ہوئی تھی۔ اب وہاں باسط کی حکمرانی تھی۔ اس کا جیتا جاگتا تصور براجمان تھا۔

دل کے اس اختیار پر وہ ششدر تھی۔

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر وہ ہر بجو کتنی ہی دیر تک باسط کی خیریت سے آنے کی دعائیں مانگتی رہی تھی پھر چونکہ اراکے اس انکشاف نے اسے سرتاپا لرزاکر رکھ دیا تھا کہ وہ شام میں گاڑی لے کر گیا ہے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ بیرونی دروازے سے داخل ہو کر لاؤنج سے ملحقہ کمرے میں بیٹھ گیا اور ان دونوں کی گفتگو سنتا رہا تھا۔ اس کی غیر موجودگی کے خیال سے انہوں نے کوئی احتیاط بھی نہ کرتی تھی۔ وہ سب سنتا رہا تھا۔ ساری حقیقت اس کے آگے عیاں ہو چکی تھی۔ کل رمضہ کے منہ سے عاقب کا نام سن کر

ساری رات اس نے جس ٹینشن میں گزاری تھی اور صبح کھائے پیے بنا گھر سے نکل گیا تھا۔ سب سن کر اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ وہ متوحش سی ٹہل رہی تھی۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی اس کے آنسوؤں کی روانی کم نہ ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں رمبہ کی آواز کوئی نہ رہی تھی۔

”مرد خود خواہ کتنی ہی غلاظت میں تھڑے ہوں مگر اپنی شریک حیات کے متعلق معمولی سی بھی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا ظرف بہت کمتر ہوتا ہے۔“ باسط کے کل سے اب تک کے سروخا موش رویے نے رمبہ کی بات کی تصدیق کی تھی۔ رات گئے وہ لوٹا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“ باسط دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ جواندیشوں و موسوں میں ادھ مری ہو چکی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر بے اختیار اس کے بازو سے پٹ کر رو پڑی تھی۔

”فسوس ہو رہا ہے میرے زندہ واپس آنے پر.....“ وہ اس کی گرفت سے بازو چھڑا کر ترش روی سے کویا ہوا تھا۔ وہ شاکڈرہ گئی۔

”یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس کی آواز کانپتی ہوئی تھی۔

”آج کچھ پکایا بھی ہے یا سوگ مناتی رہی ہو؟“ نکھرے بال ٹھنکن آلود لباس سُرخ بے خوابی ظاہر کرتی مشتعل آنکھیں زبان سے شعلے برساتا وہ شخص آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

”کس کا سوگ؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ وہ کانپتی آواز میں بولی۔ جو اب اس کے چہرے سے چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں۔ وہ بھسم کر دیئے والی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے لفظ لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔

”میری سماعتیں بے اثر نہیں ہیں میری بصارت کام کرتی ہے۔ میں تمہارے کل سے آگاہ ہو چکا ہوں۔“ وہ کچھ توقف کے لیے خاموش ہوا تھا۔

”تم نے مجھ سے فراڈ کیا..... چھپلا اپنا ماضی اور اپنا داغ دار کردار لیے مجھ سے مانا جوڑ لیا۔“ زبان کویا دودھاری تلوار بن گئی تھی۔

”باسط صاحب پلیز! آپ نے سب سن لیا ہے تو یہ بھی سن لیا ہوگا کہ آپ جو سوچ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے عاقب.....“

”بہت سن چکا ہوں تمہارے منہ سے تمہارے عاشق کا نام۔ دن تو تم اس کی یادوں میں بسر کرتی ہو۔ راتوں کو خوابوں میں بھی اسے پکارتی ہو۔ مجھ سے بڑا بے غیرت کوئی نہ ہوگا جو تم جیسی عورت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں جو ساتھ میرے بے مگرایا دوں میں دوسروں کی رشتی ہے۔“ وہ اس وقت شقی القلب و تنگ نظری کی پستی میں گرا ہوا سنگ دل لگ رہا تھا۔ شدید اشتعال میں وہ محسوس بھی نہ کر سکا کہ کتنی نازیبا زبان استعمال کر رہا ہے۔

”آپ نے صرف اپنے مطلب کی بات سنی اور چلے گئے اور اب اپنی پست ترین ذہنیت کی عکاسی کر کے میرے صاف و شفاف ماضی کو گروڈا لود کر رہے ہیں۔“ عورت ہر دکھ ہر ستم ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہے مگر اپنی پاکبازی و عصمت کی اجلی چادر پر رسوائی یا شک کی معمولی سی گرد بھی اسے شیر بنا دیتی ہے۔ وریشا بھی اس کی بہتان آمیز گفتگو برداشت نہ کر سکی تھی۔

”یکو اس بند کرو۔ میں خود بخود کو تکلیف دینا رہا۔ شادی کی پہلی شب جو تمہارے ساتھ برتاؤ کیا۔ ہر وقت تمہاری تو ہین وڈ لیل کی اور پھر یہاں لا کر رہنے پر کچھ عرصے بعد ہی میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کیا کہ اس صابر و تابعداری لڑکی کو کیوں تم گھر والوں کی زیادتی کی سزا دے رہے ہو؟ تمہاری خاموشی خدمت گزاری کی بھی لالچ کے بغیر میرا خیال رکھنا ہر کام بنا کہے کرنا اور اس پر مستزاد گھر والوں کی ہر روز کی تحریصیں سچی محبت کے مظاہروں نے غیر محسوس طریقے سے مجھے تمہارے متعلق سوچنے پر راغب کر دیا تھا۔ میں جو شروع شروع میں تم سے بھاگتا تھا۔ تمہاری صورت سے چپ تھی مجھے پھر میں محسوس کرنے لگا۔ آفس میں مجھے نام گزرا دینا دھوا لگنے لگا ہے۔ میرے اندر جلد سے جلد گھر بھاگنے کی خواہش رہنے لگی تھی اور گھر آ کر میرا ہر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ چوری چوری میں تمہارا مشاہدہ کرنے لگا کہ جو تبدیلی میرے اندر سرایت کر چکی ہے اس نے تمہیں بھی متاثر کیا ہے یا نہیں.....“

چھ ماہ کی بھڑاس آج اس کے سگلتے لہجے سے عیاں تھی۔

”مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہارا انداز وہی تھا کسی رو بوٹ کی طرح جذبات و احساسات سے عاری وجود۔ سپاٹ چہرہ و بے جان تم کسی مشین کی طرح اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہو۔ پہلے میں نے خیال کیا شاید میرے برے رویے نے تمہارا دل توڑ دیا ہے۔ تم مجھ سے بدظن ہو گئی ہو اور میں اپنے رویے کی تلافی کرنا ہی چاہتا تھا کہ اتنا قائل نے تمہاری امی سے ہونے والی تمہاری گفتگو سن لی جس میں تم نے ان سے یہ کہہ کر ریسورٹ دکھ دیا تھا کہ تم ان کے لیے مریچکی ہو۔ آئندہ وہ تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔“

وہ ایک کے بعد ایک انکشاف کر رہا تھا۔

”اس وقت میرے دل میں تمہاری جانب سے بدگمانی نے جنم لیا تھا کیونکہ کچھ ایسے فقرے میں نے اسی طرح جذباتی انداز میں بے جی سے کہے تھے جب انہوں نے منہ سے شادی کی خواہش پر میرا بایکات کر دیا تھا۔ تمہاری لائقیتی و بے نیازی کا ایک سرالامہ تو رفتہ رفتہ ساری گرہیں کھلنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے بہت مواقع مجھے ملے۔ تمہیں سمجھنے کے منہ کی آمد میری اس سے شادی کا پلان راتوں کو اس کی کا فرم سب پتھر کی صورت کی طرح دکھتی رہیں، منتی رہیں۔ میں منتظر رہا کہ تم مجھے منہ سے ملنے سے روکو۔ اس کی کال فرمائیں تو میل اٹھا کر پھینک دو۔ مجھے شادی نہ کرنے دو..... مگر تم نے میری ہر سوچ کی نفی کی گھر والوں کو بھی جھوٹی تسلیاں دیتی رہیں۔ یہاں مجھے پوری آزادی منہ سے ملنے کی دی۔ سنا تھا عورت مرد کے مقابلے میں معمولی سی بھی شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ منہ کا لقمہ تقسیم کر سکتی ہے شوہر نہیں..... تم نے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر مجھ سے شادی تو کر لی مگر مجھے مجازی خدا کا رتبہ و مقام نہ دے سکے۔ کچھ دن قبل تمہیں خواب میں عاقب عاقب پکارتے دیکھ کر میرے شک کو ادھال دینا ملا تھا۔ کل سے آج تک اس پر یقین و صداقت کی پکی ہر لگ گئی ہے۔ مردانہ بے وفائی پر..... ایک طوائف کو تو معاف کر سکتا ہے مگر ایک ایسی لڑکی کو نہیں جو علیٰ معتر خانہ ان کا لیبل جا کر کسی کی بیوی بنی ہو۔ یہ ٹکٹ ہے صبح ڈرائیور تمہیں ایئر پورٹ چھوڑ آئے گا۔ کراچی جا کر اپنے منہ سے بے جی کو اپنے ماضی کی داستان سنانا۔ بہت ناز بے انہیں اپنی عزت دار خاندانی بہو پر۔ صبح میرے اٹھنے سے قبل یہاں سے چلی جانا ورنہ.....“

وہ سارا زہر اگل کر ٹکٹ اور کئی نوٹوں کی گلدیاں اس کی طرف اچھال کر لیے لیے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کی جانب دیکھے بنا جواتے بڑے الحرام اتنی بڑی گالی کو سن کر وہ ہٹھکی کی ہٹھکی رہ گئی تھی۔



سلیپنگ پلر کھا کر وہ دن چڑھے تک سوتا رہا تھا۔ اٹھا تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ اٹھتے ہی بیڈٹی کی طلب بیدار ہوئی تھی۔ بے ساختہ نگاہ سائیڈ ٹیبل پر گئی جہاں پر صبح بھاپ اڑاتا کپ اس کے لیے موجود ہوتا تھا۔ وہ بنا کہے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی اور اسی سبب اس کا دل نرم کر چکی تھی۔ اس کا تصور آتے ہی اس کے ہونٹ نفرت آمیز انداز میں سکڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہاں جا کر اسے پھر جھٹکا لگا تھا۔ ٹنگر اس کے استری شدہ سوٹ سے خالی تھا۔ وہ جھنجھلا تا ہوا لہجہ پر آیا تھا۔ وارڈروب سے سوٹ نکالنے میں اس کو از حد دشواری ہوئی تھی۔ حالانکہ تمام سوٹس استری شدہ ہینگ ہوئے تھے مگر اسے عادت کہاں رہی تھی۔ وریشا از خود یہ کام کرتی تھی۔ ہاتھ لے کر آیا تو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہر شے اسے خود سے دور محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایلیلی خوشبو نکھیرنا خاموش وجود اس کی نگاہوں میں متحرک رہا تھا۔ وہ ہر صبح اس کی تیاریوں میں اس طرح مدد کرتی تھی۔ وہ اس کے بریف کیس میں فائلز اور دیگر چیزیں رکھتی تھی۔ روز لا پرواہی سے وہ اپنا سامان ادھر ادھر رکھ دیا کرتا تھا۔ وہ یاد سے اس کے لباس کی جیبوں سے منتقل کرتی تھی۔ ٹیبل پر اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہکتا ناشتہ اسے اپنی جانب راغب کر لیا کرتا تھا۔

وہ خوبیوں کا مرقع تھی۔ ہر کام بڑی پھرتی و سلیقہ مندی سے کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے پکے کھانوں میں اتنی لذت ہوتی تھی کہ وہ چائے بھی باہر بیٹا پسند نہیں کرتا تھا۔ آج کو یا سب ختم ہو گیا تھا۔

وہ تیار ہو کر آیا تو گھر میں سناٹے بین کر رہے تھے۔ ویرانی درو دیوار سے پٹ پٹ کر نوہ کناس تھی۔ کل تک جو خاموش وجود کے دم سے یہاں بہاروں کے پیراہن لہپاتے تھے۔ اب وہاں خزاں اپنا خاک آلود سراپا ڈالے بیٹھتی تھی۔

وہ دل کی صدائوں کو قدموں تلے کچل کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ اندر ٹیبل پر اس کے نوٹوں کی گلدیاں یوں ہی پڑی تھیں۔ البتہ ٹکٹ غائب تھا۔

”گیٹ لاسٹ۔“ وہ تصور میں چھائے اس کے سراپے سے مخاطب ہوا۔ گیٹ لاک کر کے باہر آیا تو چوکیدار نے بتلایا۔ بیگم صاحبہ صبح ایئر پورٹ چلی گئی تھیں۔ اس کا ذہن بے شمار منتشر و مضطرب کا ڈھکھا تھا۔ اندر اتنی وحشت و بے سکونی پھیلی ہوئی تھی کہ دگ رگ اسے چنچنی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں اتنا اشتعال و جنون تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگانے کو دل چاہ رہا تھا۔ کتنا وقت سڑکوں پر منگشت کرتے ہوئے گزرا تھا۔ دل کو چین و قرار کی طہر نہ ملا تو وہ منہ کی طرف آگیا جو اسے دیکھ کر پھولوں کی طرح کھل اٹھی۔

”مل گئی فرصت؟ نہ کال ریسو کرتے ہو نہ گھر پر ملے ہو۔ واج مین باہر سے ہی کہہ دیتا ہے۔ صاحب گھر پر نہیں ہیں..... کہاں ہو تم؟“ بڑے ناز سے اٹھا کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ سیاہ ویلوٹ کا چست لباس، پورٹو خوشبوؤں سے مہکتا وجود اور خوب صورت چہرے پر نازہ میک اپ کی سرخیاں۔ انداز میں بلا کی وارنٹی و والہانہ پن اس کا ہر انداز دلربائی و رعنائی سے بھر پور تھا۔

”پلیز چائے پلو آؤ۔ اپنے ہاتھوں کی دہائی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“ باسط آنٹی کو سلام کر کے اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے شکوے از خود نظر انداز کیے تھے اس نے۔

”چائے..... کور میں بناؤں اپنے ہاتھوں سے؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”میں نے تمہیں کوئی جھوک نہیں سنایا۔ چائے کی فرمائش کی ہے۔“ آگ اس کے اندر پہلے ہی بھڑک رہی تھی۔ قریب بیٹھتی منہ کی ہنسی اور آنٹی کی مسکراہٹ نے اس کو اور تپاڑا۔ وہ سنجیدگی سے کویا ہوا۔

”باسط بیٹا! اس خدمت کرنا۔ منہ نے ایک برتن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کچن میں کیسے کام کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں جانتی۔ تم اس سے چائے بنانے کا کہہ رہے ہو۔“

”چلو باہر چلتے ہیں کسی فضا تک سے ہوٹل میں چائے پیئیں گے۔“ منہ نے اپنا سر میں بازو اس کے شانے پر رکھتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

”واپسی میں کھانا پیک کروا کر لے آنا۔ حرام خور ملازمہ نے آج چھٹی کر لی ہے۔“ اندہ ذہل روٹی کھا کر میری بھوک نہیں مٹی۔ باسط بیٹا! جو اور پیسے سے بنا وہ اصلی گھی والا طوطہ ضرور لے کر آنا۔ پچھلی دفعہ منہ نے مجھے چکھلیا بھی نہیں تھا۔“

”تو بتو بہما! کس قدر جھوٹی عورت ہیں آپ۔ کھا کر مکتی ہیں۔“ منہ کے انداز پر باسط چپ نہ رہ سکا تھا۔

”یہ کس طرح بات کر رہی ہو تم آئی ہے؟ ماں ہیں تمہاری بزرگ ہیں۔“

”تم نہیں جانتے ڈیئر! میں جانتی ہوں ان کی بزرگی۔“ اس کے انداز میں مڑتھا۔

”اوکے آئی! میں کل آپ کو ملوہ لا دوں گا۔ اس وقت شاپ بند ہوتی ہے۔“

”سرور کی وجہ سے مجھے سے ڈرائیونگ نہ ہو سکی گی۔ منزہ آج تم میری خاطر چائے بناؤ اور نہ صرف چائے بلکہ مکمل کوکنگ سیکھو۔ میں ہر روز بازار کے کھانوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں میری خاطر سب کرنا ہوگا۔“

”ارے تم مجھے بیوی بنا کر لے جانا چاہتے ہو یا اور جن؟ کم از کم مجھ سے ایسی امید مت رکھنا۔ مجھے گھر کے کاموں سے المرجی ہے۔ دم گھٹتا ہے میرا۔“ منزہ وریشا کو دیکھ چکی تھی کہ اس نے کتنی نفاست و سلیقہ مندری سے پورا گھر سنبھالا ہوا ہے مگر اس کا خیال نہ تھا کہ باسط اس سے بھی ایسی توقع رکھ سکتا ہے اور اب اس کے خیالات نے دونوں ماں بیٹی کو چونکا دیا تھا۔

”بیٹا! تم بھی کسی دقیا نوی باتیں کر رہے ہو۔ اس دور میں تو غریب غربا بھی دو تین ملازم فوراً کر لیتے ہیں اور تم تو اے گریڈ کے آفیسر ہو۔ تمہیں نوکروں اور دولت کی کیا کمی..... ایک اشارے پر ملازمین کی لائن لگ جائے گی۔“

جواباً باسط کے گھڑتے تیور دیکھ کر وہ کھسیا کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

”آرام سے بیٹھو۔ میں بنا کر لاتی ہوں چائے۔“

”میں جا رہا ہوں رہنے دیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں بیٹا! ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے پہلی بار کوئی فرمائش کی ہے تم نے اور ایسے ہی جاؤ گے۔ تم بیٹھو فافٹ بنا کر لاتی ہوں۔“ اس کے اکھڑے اکھڑے رویے سے خطرہ محسوس ہوا تو وہ منزہ کو اشارے سے سمجھا گئیں۔

”تم یہاں لیٹو ڈرائنگ! میں سرد باتی ہوں۔ دیکھنا کیسا سکون ملتا ہے۔“ اس نے بازو پکڑ کر اسے آغوش میں گر لایا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”اوہ گاڈ! تم تو ایسے دور بھاگتے ہو جیسے میں کوئی بلا ہوں۔ ہم میاں بیوی ہیں پھر تمہاریوں دور دور ہنا مجھے سمجھ نہیں آتا ہے۔“

”ہم میاں بیوی ہیں نہیں..... ہونے والے ہیں یا درکھا کرو۔“

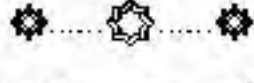
”یہ سوشل اینکونٹری صرف دکھاوے کی ہوتی ہیں ورنہ تم مجھے چاہتے ہو میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ ہمارے دل ایک ہیں ہمیں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔“ وہ شانے اپکا کر ٹھوس لہجے میں کوپا ہوئی۔

”مجھے تم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یا تم مجھے سمجھ نہیں سکی ہو۔“

”اوہ..... کم آن ڈیئر! نہ معلوم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ چلو ہر پلٹے ہیں۔ گھر بیٹھے بیٹھے پور ہو گئی ہوں۔“ اسے سیریس دیکھ کر منزہ نے بات بدلی۔

”تم کتنی تو تمہیں مجھ سے محبت ہے تو یہ کیسی محبت ہے جو تم میری صورت دیکھ کر میرے خاکستر ہوتے دل کا اندازہ نہیں لگا سکی ہو۔ مجھ پر جان دینے کی قسمیں کھانے والی۔ ایک کپ چائے بنانے کی قربانی نہیں دے سکتی؟ جو محبت کرتے ہیں وہ چہرہ دیکھ کر دل کا بھید پا لیتے ہیں بنا کہے دروغ سمجھ جاتے ہیں..... تمہاری یہ کیسی محبت ہے؟ کیسی انجانی چاہت ہے جو مجھے شناخت نہیں کر پارہی۔ میں کرب کی دھوپ میں تپتا ہوا تمہاری پیار کی چھاؤں کی آس میں آیا تھا اور تم مجھے بنا سمجھے اپنی کہے جا رہی ہو۔“ پہلی بار اس کے دل میں منزہ کی جانب سے تنفر جاگا تھا مگر صرف سوچ کر رہ گیا تھا۔

آئی چائے لے آئی تھی۔ ساسر اور کپ چائے کی پتی پتی لور چائے سے بد نما تھے۔ کپ کے کناروں پر پتی چمکی ہوئی تھی اور کچھ جھڑ کر ساسر میں چمکی ہوئی چائے پر تیر رہی تھی۔ اس پر مستزاد کم پتی کو کم دودھ والی بے رنگ چائے دیکھ کر ایک گھونٹ سے بغیر ہی واپس چلا آیا تھا۔



وقت جو کبھی اتنی سرعت و پھرتی سے گزرتا تھا کہ اسے اس کے گزرنے کا گلہ رہتا تھا۔ ان آنکھ دنوں میں جیونٹی کو بھی مات دے چکا تھا۔ وہ آفس سے چھٹیاں لے چکا تھا۔ عجیب بیزاری و پڑمردگی اس کی ذات کا گھبراؤ کر چکی تھی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو نہیں پا رہا تھا جو اسے ان راستوں پر گامزن کر رہا تھا جس کو وہ دھتکار چکا تھا۔ ٹھوکر مار چکا تھا۔ پہلی نظر میں وہ جس کو ناپسندیدہ قرار دے چکا تھا۔ دل کے نہ معلوم کون سے خفیہ تہ خانے میں وہ اسی لمحے چھپ گئی تھی۔ وہ اس کو محسوس نہ کر سکا تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تنہا دور درخت بن گیا تھا۔ شدید طیش و اشتعال میں وہ اس جذبے کو کچلنے میں مصروف تھا اور مسلسل ناکامی کا شکار بھی۔ وریشا کی موجودگی میں کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے وجود کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ اس سے دور رہنے کی خواہش کے باوجود وہ خود کو تنہا اور نامکمل محسوس کر رہا تھا۔ وریشا کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ان چند دنوں میں اس پر بے شمار احساسات و حقائق منکشف ہوئے تھے۔ اسے خود اعتمادی کا موقع ملا ضمیر نے نہایت فرض شناسی و دیانت داری سے اس کے طرز عمل اور وریشا کی ثابت قدمی و ہر واستقامت کا موازنہ کر ڈالا تھا جب اسے ضمیر کے آئینے میں صورت دیکھنی پڑی تو وہ ششدر رہ گیا۔ منافقت و ریا کاری سے اس کا باطن سیاہ ہو رہا تھا۔ ذات کا ہر خفیہ پہلو کردار کا ہر جھول اسے نظر آ رہا تھا۔ ضمیر کی حدالت لگ چکی تھی۔ وہ کٹہرے میں سر جھکا کے کھڑا گزرے وقت کے منظروں میں گم تھا۔

وریشا اور اس کی شادی کو چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران کوئی دن ہی ایسا گزرا ہو گا جب اس نے اسے اپنی ناپسندیدگی کا احساس نہ دلایا ہو نہ بتایا ہو کہ وہ اس کی پسند نہیں ہے۔ زبردستی بے جی کی خاطر وہ اسے برداشت کر رہا ہے۔ عورت کی ان کتنی لاغر ہوتی ہے۔ یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ جان بوجھ کر وہ اس کی انا کو گھائل کرنا رہا تھا۔ عزت نفس کے پندر پر ضربیں لگانا رہا تھا اس لیے کہ وہ اس کے ٹھنڈے انتقام سے گھبرا کر چلی جائے، چھوڑ جائے اسے کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور وہ سرخرو ہو جائے..... اب وہ چلی گئی تھی تو اس کا دل بالکل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی ساری بے حسی و بے نیازی یاد آ رہی تھی اور وہ ضمیر کے شکبے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

”تم جو خود کو اتنے بری سمجھتے ہو آزادو خود مختار زندگی گزارنے کے عادی ہو۔ اپنی من مانی کرنا تمہاری سرشت میں شامل ہے۔ کل منزہ تمہاری منزل تھی جس کی خاطر تم نے اس لڑکی کی قدم قدم پر اسلٹ کی جس کو تم اپنا نام دے کر لائے تھے۔ آج منزہ کے تصور سے بھی تم المرجک ہو اور تمہارا اس لڑکی کی یادوں میں گم ہے جس کی کل تک تمہاری نظروں میں کوئی وقعت نہ تھی۔“ وحشتوں و جنوں خیزیوں کے بادل جب چھٹے تو اسے حواسوں پر پڑا پردہ بھی اٹھتا ہوا محسوس ہوا اور وہ نہایت غیر جانب داری سے اپنا تجزیہ کرنے لگا۔

”تم جو ہر لمحہ وریشا کو یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ تمہاری محبت نہیں ہے۔ تم ایک دن بھی یہ انکشاف برداشت نہ کر سکے کہ وہ..... بھی کسی سے محبت کرتی ہے کوئی اس کی زندگی میں بھی اتنا اہم رہا ہے۔ اس حقیقت نے تمہیں کتنی تکلیف دی تمہاری بھوک و پیاس نیند و آرام سب ہوا ہو گیا اور تم جو لوگوں میں بہت مہذب و نرم مزاج سمجھے جاتے ہو اچانک ہی اتنے اجڈ، کم ظرف، کینہ پرور و ظالم بن گئے کہ جو زبان پہ آیا بنا سوچے سمجھے کہتے چلے گئے۔ ذرا بھی تمہیں احساس نہ ہوا کہ اس لڑکی کے دل پر کیا گزرنے لگی جو بہت قتل و بر دباری سے وہ سب برداشت کرتی رہی جو کوئی دوسری لڑکی ہر گز برداشت نہ کرتی۔ تم مرد ہو کر کم ظرف و کم حوصلہ نکلے ہو لڑکی ہو کر تم سے بلند و بلند حوصلہ نکلی۔ بے جی ٹھیک کہتی ہیں وقت پر کھرے کھولے کی پہچان انارڈی کو بھی ہو جاتی ہے میں بھی ایسا ہی لاڈلی تھا وقت پڑنے سے قبل سمجھا نہیں تھا۔

وریشا کی جدائی نے آنکھوں سے تمام حجاب اٹھا دیے ہیں تو منزہ کی قربت نے دل کی چاہت کو سمجھنے میں آسانی فراہم کر دی ہے۔ ان نو دس دنوں میں گھر کی تنہائی و دل کی وحشت سے گھبرا کر وہ بار بار منزہ کی طرف بھاگا تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس وحشت و جنوں سے گھبرا کر منزہ سے شادی کر بیٹھتا۔ جس کو نہ معلوم جذبے کے تحت ہلائی کرنا آ رہا تھا کہ منزہ اور اس کی ماں کی حرکات و سکنات پوری طرح اس کی نگاہوں میں آ گئی تھیں۔ منزہ سے اس کا فیئر بہت پرانا تھا لیکن گھر والوں خصوصاً بے جی کو یہ فیملی قطعاً پسند نہ تھی۔ وہ کہتی تھیں۔ منزہ کی ماں کے چال چلن شروع سے ابھی نہیں ہیں کیونکہ وہ شریف گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ کسی ناچنے والی کی بیٹی ہے جس نے اپنے شوہر کو دوسرے آدمی کے چکر میں زہر دے کر ماریا تھا اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ خاندانی نام و نمود کو جان سے بڑھ کر اہمیت دینے والی ہے۔ جی کسی ایسی ماں کی بیٹی کو بہو بنانے کے تصور سے بھی نا آشنا تھیں اور وہ ان دنوں اس کی محبت کی شدت میں اس حد تک مبتلا تھا کہ خاموشی سے کورٹ میرج کرنے پر رضامند ہو گیا تھا پھر نہ معلوم اس کی تقدیر کا فریب تھا یا بے جی وہاں کی دعاؤں کا اثر۔ اس ہفتے وہ فرم کی جانب سے بٹاک چلا گیا تھا جہاں سے واپسی میں خبر ملی کہ منزہ شادی کر کے مارشس میں جا رہی ہے۔ اس خبر سے جہاں اس کے دل کی دنیا تباہ و برباد ہوئی۔ وہاں گھر والوں کے خلاف دل میں بدگلی و بے رخی کی فصل بھی اگ آئی تھی۔ اس کے خیال میں ایسا کرنے کے میں گھر والوں کا ہاتھ ہے کیونکہ منزہ اور اس کی ماں ان کی ناپسندیدگی سے واقف تھیں۔ بے جی نے اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جو علی عزت دار خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور نہ صرف منزہ سے زیادہ خوب صورت تھی بلکہ خوب سیرتی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بے جی کی خواہش اس نے ٹھوکر میں اڑا دی تھی اور گھر چھوڑ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ ان کے ہارٹ اٹیک اور سیریس حالت نے اس کے تمام حوصلے و اشتعال بھلا دیے اور وہ ان کی زندگی کی بقا کے لیے یہ کڑوا ترین گھونٹ پی گیا اور ساتھ واضح بھی کر دیا تھا کہ وہ لڑکی صرف ان کی ضد کی وجہ سے اس گھر میں آئی ہے۔ وہ اس کو وہ مقام ہر گز نہیں دے گا جو منزہ کا حق تھا اور یہ کہ وہ اس سے کچھ نہیں چھپائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

لیکن جواباً وریشا کا کپڑا و مائر اس کے ساتھ ساتھ گھر والوں کا بے حد خیال کرنا بہت کم وقت میں وہ سب کے دلوں پر راج کر رہی تھی۔ سب کی زبان پر اس کی تعریف و توصیف تھی جو اس کی خواہش کے برعکس تھی۔ وہ اسے لے کر ایبٹ آباد چلا آیا تھا تا کہ اپنی نفرت و ناپسندیدگی کے تمام تر کش سے اسے گھائل کر ڈالے اور وہ بھاگ جائے۔

منزہ نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس سے رابطہ کر لیا تھا اور اس انداز سے رورور کر شادی کرنے کی مجبوری بتائی کہ وہ قائل ہو گیا پھر اسے خبر ملی کہ منزہ کے شوہر کے انتقال کی جو روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا تھا۔ اب وہ ایبٹ آباد آ گئی تھی اور اس نے ہی اسے ریٹ پر کالنج لے کر دیا تھا۔ اس کے تمام اخراجات اسی کے ذمے تھے۔ وریشا کی مدد کے لیے اس نے ایک بھی ملازم نہ رکھا تھا جب کہ منزہ کی فرمائش پر چار ملازمین رکھوائے تھے۔ منزہ جو دور سے چمکتا سونا نظر آتی تھی قریب جا کر معلوم ہوا وہ تو صرف بدنمالوہے کا کلڑا تھا جس پر چمک دار پالش ہوئی تھی اور اب وہ پالش اتری تو خصلت کی بد صورتی پوری عیاں ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اس کی طرف بھاگا اور ہر بار پہلے سے زیادہ مایوس و بیزار ہو رہا تھا۔ راتوں کو دیر تک جاگنا دن ڈھلے بیدار ہونا ان کا معمول تھا۔ اکثر وہ ماں بیٹی کو معمولی معمولی چیزوں پر لڑتے دیکھتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے نہایت حیرت اور تاسف آمیز تھی کیونکہ ان کے گھر میں یہ انداز نہ تھا۔ لیکن تو کوئی تھی نہیں بھائی کو بھی اس نے بے جی ماں کی کا بے حد ادب و احترام کرتے دیکھا تھا پھر وریشا بھی اس کی بہت عزت کرتی تھی۔

ایسی زبان درازی بود تہذیبی کا بھی ان کے ہاں تصور محال تھا۔ ہر وقت بنی شخصی منہ رہتی تو آئی اس سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آئیں۔ اوپر عمر میں تیز فکر کے کپڑوں کو رہتاؤ سنگھار میں وہ کسی باوقار عورت کے برعکس نظر آتی تھیں۔ پہلے وہ منہ کو گیٹ سے پک کیا کرتا تھا۔ اب متواتر گھر میں جانا ہوا تو معلوم ہوا وہاں عموماً کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کوئی آئی کا کزن تھا، کوئی اکل کے رشتے دار تو کوئی منہ کا سرالی عزیز۔ وہ آتے اور دنوں قیام کر کے جاتے۔ اسے ان لوگوں کی آمد و رفت بری لگتی تھی مگر مروتنا خاموش رہا تھا اور اس دوران حقیقت کھلتی چلی گئی کہ وہ جس کو پتھر سمجھ کر ٹھو کروں میں رکھ رہا تھا۔ وہ دراصل ایسا نایاب ہیرا تھا جو اس طوطا چشم دور میں ملنا مفتوحہ تھا اور جس کو وہ کل کائنات سمجھے ہوئے تھا وہ خوب صورت سراب کے سوا کچھ نہیں تھی۔

”باسط! کیا ہوا ہے تمہیں؟ آخر کیوں مجھے پریشان کرتے ہو؟ پہلے ظالم سماج ہمارے درمیان حاصل تھا۔ اب راستہ صاف ہے تو تم دیر کر رہے ہو۔“ وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ آتش سوٹ پر سنہری لمبر ایڈری والے سوٹ میں تک سبک سے تیار نکلتی بھرے انداز میں جو گفتگو تھی۔

”تم میری شرائط مانو۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔“ اس کا انداز مختلف و سپاٹ تھا۔ محبت و جنون سرور پہنچا تھا۔

”نووے۔ تم یہ چاہتے ہو میں دھوبن بنا اور چین، بھنگن بنوں تو یہ ناممکن ہے۔ ایسے کام صرف وریشا کر سکتی ہے کیونکہ وہ ایسے گھٹیا کام کر کے تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تمہاری محبت پانا چاہتی ہے تاکہ تم اجرت کے طور پر اپنی توجہ کے چند سکے اس کے مشکول میں ڈال دو۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے ڈیئر۔ میں تمہیں حاصل کر چکی ہوں۔ تمہاری محبت و چاہت تمام کی تمام میرے نام وقف ہے۔ مجھے ایسے کسی تردد کی ضرورت نہیں ہے۔“ منہ اس کی بدلتی دلی کیفیت سے بے خبر بڑی وارفتگی سے کویا تھی اور وہ دل ہی دل میں اپنی پسند پر نام ہو رہا تھا کہ اس کو پانے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔

”محبت میں تو بندہ وہی کچھ کرتا ہے جو محبوب کی منشاء ہوتی ہے۔ اس کی پسند و ناپسند، شوق و ذوق حاصل حیات ہوتے ہیں پھر تمہاری یہ کیسی محبت ہے جو تم گھر داری جیسے مقدس فریضے کو عام سے خطابات دے رہی ہو۔ ہمارے معاشرے میں کامیاب عورت گھریلو عورت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔“

”یہ تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے باسط؟“ وہ گڑبڑائی تھی۔

”محبت کی زبان منہ! اس محبت کی زبان جس کو حاصل کر کے تم نے کھو دیا اور وریشا نے ہمیشہ کے لیے پالیا۔“

منہ کے منہ سے مارے حیرت کے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو ذرا فاصلے پر موجود تھا مگر دل سے بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو باسط! میں تمہاری محبت ہوں۔“

”نہیں۔ تم شاید کبھی میری محبت نہیں رہی بلکہ تم ایسی مصنوعی چمک تھی جو قوی طور پر مقابل کی آنکھیں بند کر دیتی ہے اور اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ کھرے کو کھولنے کی شناخت ہوگئی ہے مجھے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب کبھی نہیں ملیں گے اور کبھی اتفاقاً کہیں ملے بھی تو اجنبی بن کر گزر جائیں گے۔“

منہ دھواں دھواں چہرہ لیے اس کو تک رہی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا۔ مہرباں اچانک نامہرباں بن گیا تھا۔ جن گہری خوب صورت نگاہوں میں اس نے لپے لیے چاہت کے دیپ دیکھے تھے۔ وہاں اب کسی اور کی تصویر تھی۔

”منہ! محبت قربانی مانگتی ہے۔ چاہت وسعت قلبی و بے لوث خلوص مانگتی ہے کیونکہ ہماری زندگی صرف ہماری نہیں ہوتی۔ ہماری خوشیوں پر صرف ہماری ہی حق نہیں ہوتا۔ ہمیں بہنوں کے لیے جینا ہوتا ہے۔ ہماری سرتیس ہمارے اپنے دو بالا کرتے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ منہ کی آنکھوں پر پڑا خود پرستی و خود غرضی کا پردہ سرکنے لگا تھا مگر وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھی۔

”پلیز باسط! معمولی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ تم جو کہو گے وہی کروں گی۔ مجھے خود سے جدا مت کرو۔ میں مر جاؤں گی۔“ منہ ہچکچاہٹ پر پڑی تھی۔

”آتم سوری منہ! میں اس بندھن کو پسند نہیں کرتا جو دل سے نہ جڑا ہوا۔ میرے دل نے تب تک وریشا کے وجود کو تسلیم نہ کیا۔ اس کو محسوس نہ کیا جب تک ایک مضبوط تعلق کے ہوتے ہوئے بھی میں اجنبی بن رہا تھا۔ آج وہ نہ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ ہے تو تم کہیں نہیں ہو۔“ وہ دروازہ بند کر کے پلٹ آیا تھا۔ وہ دروازہ صرف گھر کا نہیں دل کا بھی بند کر آیا تھا اور فیصلہ اچانک نہیں ہوا تھا۔ پرسوں جب وہ اپنا اطلاع ان کے گھر پہنچا تو ان ماں بیٹی کو اپنے ان نام نہاد رشتے داروں کے سنگ اس گھٹاؤ نے فضل میں مصروف عمل پایا تھا کہ لمحے بھر کو مارے غیرت کے انہیں قتل کر دینے کے درپے ہو ا تھا مگر ملازمہ نے منت سماجت کر کے اسے باز رکھا تھا۔ ملازمہ کا کہنا تھا کہ ان کا کام یہی ہے۔ روز بنے لوگ آتے ہیں۔ منہ اور اس کی ماں کے اس روپ نے اسے بی جی کی ہر بات بچھ ثابت کر دی تھی۔ وہ ملازمہ بھی وہاں مزید کام کرنے پر رضامند نہ تھی۔ وہ تنخواہ دے کر اسے فارغ کر آیا تھا۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ یہی وجہ تھی کہ منہ کو دیکھ کر اس میں کوئی ایسی خواہش نہیں جاگتی تھی۔ وہ اس پر اب کوئی جذبہ ضائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ محبت رہی نہ تھی نفرت کر کے بھی وہ اس سے کوئی رشتہ قائم کرنے سے گریزاں تھا۔ منہ سے تعلق تو ذکر وہاں دلوں کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

نیل فون کی بیل نے اسے چونکا دیا۔ گھر سے فون تھا۔ سلام دعا کے بعد کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور وہ حرف آغاز سے جوڈ انٹ پھٹکار اور ناراضگی کا اظہار سننے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ ان کی مسکراتی آوازیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر اگلے ہی پل اس کے اندیشے کی تصدیق ہو چکی تھی جب بھابی کی شوخ رازدارانہ آواز ابھری۔

”خوب انجوائے کر رہے ہو لائف! اتنے دنوں تک میں نے کسی کو کال نہیں کرنے دی کہ تمہارے پور وریشا کی تنہائی میں نکل نہ ہو۔ اس وجہ سے بے جی اور ماں جی نے وریشا سے بات کرنے کی ضد نہیں کی اور سناؤ کیسا وقت گزر رہا ہے؟ ہمارے انتخاب کی داغ بیل دو گے؟ کیا خوب پسند ہے ہماری..... ذرا پلیز وریشا کوفون دو۔ میں صرف مبارک باد دوں گی کہ بالآخر وہ تم جیسے اڑل گھوڑے کو نیل ڈالنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔“ بھابی کی شوخیاں عروں پر تھیں۔ ان کا کھٹکھٹانا لہجہ اس حقیقت کا کواہ تھا کہ وہ وریشا سے لاعلم ہیں۔ سخت سردی میں وہ پیسہ پیسہ ہو گیا۔ یہ سوچ کر اگر وہ وہاں نہیں گئی تو کہاں گئی ہے؟ پچھلے ماہ اس کے والدین اپنے بڑے بیٹے وہو کے ہمراہ مسقط چلے گئے تھے اور اس کی بہن بھی دہلی میں مقیم تھی پھر کہاں جاسکتی ہے؟ اس سوال نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ گھومتا ہوا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”باسط..... باسط! تم خاموش کیوں ہو وریشا کو بلاؤ۔“ بھابی کی آواز ابھری

”بھابی! اوریشا یہاں نہیں ہے۔ دس دن قبل کراچی کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔“ یہ یقین کر کے کہ بھابی تنہا ہیں وہ کہہ بیٹھا۔ جو بابا ان کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی۔

”باسط..... یہ کیا کہہ رہے ہو.....؟ وریشا کہہ رہی تھی کہ تم لوگ، ہنی مون ٹور پر کاغان کالام وغیرہ جا رہے ہو۔“ باسط سمجھ گیا۔ یہ سب اس نے اس لیے کہا کہ وہ ان دنوں میں منہ سے شادی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اور اس نے انہیں پریشانی سے بچانے کے لیے یہ سب کیا۔

”بھابی! میں آج ہی کراچی آ رہا ہوں۔ وہاں بیٹھ کر تمام گفتگو بتاتا ہوں۔ میں ابھی گھر نہیں آؤں گا کیونکہ مسئلہ بڑھ جائے گا۔ آپ کسی فریڈ کا کہہ کر وہاں گلشن والے پارٹمنٹ میں آ جائیں۔ میں جلد پہنچ رہا ہوں۔“



”اب کہاں ڈھونڈیں اسے.....؟ تم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے باسط۔ یہ سب کرنے سے قبل کم از کم مجھ سے ہی پوچھ لیتے تو یہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔“ اسے کراچی آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس دوران وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا اوریشا کو تلاش کرنے کی اور نا کام رہا تھا۔ بھابی اس ننھن گھڑی میں اس کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہی ڈھونڈ کر رمشہ کا ایڈریس معلوم کیا مگر وہاں سے بھی ناکامی ہوئی تھی کیونکہ جس دن باسط یہاں پہنچا تھا اسی دن وہ کینیڈا کے لیے روانہ ہوئی تھی مگر وہاں کا کمیٹک نمبر وہ حاصل نہ کر سکی تھیں۔

”آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟“ اس کے دھیسے لہجے میں استعجاب تھا۔

”ہاں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تھوڑی تھی۔ وریشا کا فیملی بیک گراؤڈ ہم سے چھپلا نہیں گیا تھا کیونکہ وریشا عاقب کی حادثاتی موت کے بعد کسی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے خیال میں یہ اس سے منسوب ہونے والے شخص کے ساتھ انصافی و جرمت تھا کہ جو محبت وہ عاقب سے کرتی تھی۔ اس محبت کا اظہار وہ کسی دوسرے سے کرے۔ یہ اس کی اپنی منطقی سوچ تھی جو گھر والوں کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے ابھی جذباتی عمر ہے۔ کل جب یہ دور گزر جائے گا تو وہ ہاتھ ملتے رہ جائے گی۔ جانے والے جاتے ہیں کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو بھی صبر آ جاتا ہے۔ اس کے والدین کو معلوم تھا وہ جلد سن بھل جائے گی۔ اس کے لاکھ انکار و مخالفت کے باوجود انہوں نے اس کی شادی کر دی۔ ادھر تم ماں اور بے جی کے دباؤ میں آ کر شادی تو کر بیٹھے مگر سمجھتے نہ کر سکے پھر سب تمہارے سامنے ہے۔ عاقب صرف مگسیر تھا اور تم مجازی خدا۔ ایک طرف تمہارا جیتا جاگتا زندگی سے بھرپور وجود تھا تو دوسری جانب نظروں سے لوجھل منوں مٹی تلے دبا ہوا مردہ وجود۔ زندگی کے طالب زندہ لوگ ہوتے ہیں پھر عورت کی حقیقی محبت شادی کے بعد شروع ہوتی ہے جو رزق و روزیہ سے وریشا کو ہوگئی تھی۔ خود سوچو اگر وہ عاقب کی محبت میں مبتلا ہوتی تو تم سے نوراجان چھڑا سکتی تھی۔ تم نے کیا کچھ نہ کیا اس کے ساتھ اور وہ برداشت کرتی رہی۔ صرف اس لیے کہ تم اسے علیحدہ نہ کرو چھوڑ دو۔“

”بھابی! کیا وہ مجھ سے محبت کر سکتی ہے؟ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی..... میں نے بہت پریشان کیا ہے اسے بہت ترپایا بہت ستایا ہے..... اور..... اور اسے گالی بھی دے ڈالی۔“ سرخ آنکھیں، نکھرے بال پریشان حلیہ ان چند دنوں میں وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

”عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر مرد کے لبوں سے نکلا ایک بے اعتمادی کا جملہ اس کی خودداری و عزت نفس کو گھٹا کر دیتا ہے۔ وہ ایسی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی جو اس کی روح کو زک پہنچائے۔“

”وہ مجھے ایک دفعہ مل جائے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ بدلے میں جو سزا دے گی مجھے منظور ہوگی۔ وہ ایک بار آ جائے۔ میں منالوں گا اسے کہاں گم ہوگئی ہے۔ ایک بار آواز تو دے مجھے میں خود اس تک پہنچ جاؤں گا۔“ وہ پورے خاندان میں اپنی وجاہت، اکھڑ مزاجی و بددماغی کے باعث مشہور تھا۔ گھر والے بھی اس سے بات کرتے وقت احتیاط کرتے تھے فقط بے جی تھیں جو اس سے متاثر نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہفتے سے اسی بددماغ و اکھڑ مزاج شخص کو وہ از حد ملول و اندر دیکھ کر رنجیدہ تھیں۔



”بیٹی! دروازہ بند کرلو۔ پریشان مت ہونا۔ مجھے مارکیٹ سے آنے میں دیر ہو جائے گی۔“ بوانے برقعے کے مٹن بند کرنے کے بعد پلاسٹک کی باسکٹ اٹھائی۔ اسے تلقین

کرتے ہوئے دونوں نقاب چہرے پر گر کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اس نے دروازہ بند کر کے پردہ برابریا پھر جھاڑواٹھا کر صحن کی صفائی کرنے لگی۔ صحن کے وسط میں آم کا درخت تھا۔ موسم نہ ہونے کے باعث پھل تو نہ اڑتا تھا مگر پتوں سے جلد ہی آنگن بھرنے لگتا اور وہ اسی طرح جھاڑواٹھا کر صفائی میں جست جاتی تھی۔ جھاڑو دے کر تمام پتے اکٹھا کر کے اس نے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ سائیز میں لگنل سے پائپ لگا کر پورا صحن دھو ڈالا۔ ولہڑ لگانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں فرش پر بچھی دری کے اوپر سفید براق چاندنی بچھی ہوئی تھی جس کے کناروں میں پھول دار رنگین کپڑوں کے غلاف گاؤتکیوں پر تھے۔ کمرے کے دوسرے حصے میں نماز کی جگہ تھی اور اوپر ایک میں قرآن پاک رکھا تھا۔ ایک کے ہک سے آف وائٹ نیچ لنگ رہی تھی جو اندھیرے میں مشعلوں کی طرح چمکنے لگتی۔ روشنی میں اس کا رنگ ایسا ہی رہتا تھا۔ کمرہ صاف تھا۔ وہ صحن کے سائیز میں بنے کچن میں آگئی۔ دوپہر کا پکا ہوا آلو قیمہ موجود تھا۔ اس نے آنا کو نہ کر رکھ دیا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر روٹیاں پکائیں۔ چائے تیار کیا تاکہ اُس کے آتے ہی چائے لے آئے۔ عصر کے بعد مغرب کی نماز سے وہ فارغ ہوئی تو اس کا دل گھبرانے لگا۔ ”وا! ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ وہ دیر ہو جانے کا کہہ کر گئی تھیں مگر اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔“

آج سردی بھی زیادہ تھی۔ کوئٹہ کی تیز ہواؤں نے کراچی کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ رات کو تیزی سے پھیلنے دیکھ کر وہ بدحواس تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا کمرے؟ اسی دم باہر کا رکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ بھاگ کر دروازے پر رگ گئی۔ باہر سے آئی ہوئی آواز سن کر اس کے بدحواس دل کو تسلی ملی تھی۔

”کہاں چلی گئی تھیں؟“ وہ لایہاں فکر کے مارے میرا حال ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ ان کی دستک پر دروازہ کھولتے ہی وہ مخاطب ہوئی مگر ان کی پیشانی اور ننگ پر بندھی ٹیوں نے اسے پریشان کر ڈالا۔

”کیا ہوا یہ چیونٹیں کیسی ہیں؟“ وہ ہمارا دے کر اندر لاتے ہوئے کوپا ہوئی۔

”معمولی سی چیونٹیں ہیں جی! سڑک پار کرتے وقت ایک کار سے ٹکرائی تھی۔“ وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگیں۔

”یہ کار والے بھی سڑک کو اپنی جا گیر سمجھتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے چلا تے ہیں۔“ وہ ان کے سر ہانے تکیہ رکھتے ہوئے غصے سے بڑبڑاتی تھی۔

”جی! غلطی میری تھی۔ وہ بے چارہ تو بہت شریف لڑکا تھا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ بڑے اسپتال میں لے کر گیا تھا مجھے۔“ منٹوں میں ہزاروں روپے خرچ ہو گئے اس کے۔ پرائیویٹ اسپتال والے کس طرح کھال کھینچتے ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود کوئی ٹیسٹ کروائے۔ ایکسرے لٹراساؤنڈ۔۔۔۔۔ کیا کچھ نہ کر ڈالا انہوں نے روپے سینے کے چکر میں اور وہ بچہ بنا منہ بنائے اوائیگی کرنا گیا۔ دوائیں بھی اتنی ہنگی دی ہیں کم بختوں نے یوں دیر ہو گئی۔“ وہ افسوس سے کہتی تھی۔

جس نے ان پر خود بخود ہزاروں روپے برباد کر دیے تھے۔ وہ ان کے برہم والے پلنگ پر لیٹی ان کی سادگی پر مسکرا رہی تھی۔

”وا! اپنی چیونٹیں اور تکلیف نہیں دیکھ رہی ہیں۔ اس کی خاموت دیکھ رہی ہیں۔ بڑھاپے کی چوٹ معمولی سی بھی بہت تکلیف دیتی ہے۔“ وہ اس سرد موسم میں اکڑی گئی تھیں۔ بخار لگ، ہو گیا تھا۔ وہ ان کو ناشتہ اور دوا دے کر محلے کے سپارہ پڑھنے والے بچوں کو سبق دے رہی تھیں جب باہر دروازے کے پاس کسی کار کا ہارن بجتا تھا پھر کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے بچے کو باہر بھیجا جس نے فوراً آکر اطلاع دی۔ ”اُسے کوئی ملنے آیا ہے۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل وہ خود لنگڑاتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی تھیں اور اس بچے سے اس نوار کو اندر بلوایا تھا۔ وہ اس دوران پردے میں ہو گئی تھی۔ مضبوط جوتوں کی ٹھک ٹھک اندر جا کر معدوم ہو گئی تھی۔ وہ پردے سے نکل آئی تھی اور گرم صم انداز میں اس چھوٹے سے صحن میں پھیلی کلوں کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ کتنی جانی پہچانی شناسائی تھی یہ مہک۔۔۔۔۔

”ہش۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں کیوں آنے لگا۔ وہ تو شاید اپنی محبت کے سنگ زندگی کی حقیقی سرستیں کشید کر رہا ہوگا۔ شادی کر چکا ہوگا۔“ ان آہٹوں پر مہک پر ہنسنے والے دل کو اس نے سرنش کی تھی اور مہمان کے لیے چائے بنانے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

”آپ نے یہ تکلیف کیوں کی مینا! کل کیا کم خرچ کیا ہے مجھ پر جواب یہ اتنا سامان اٹھا کر لے آئے۔“ وہ اکی باسکٹ کل کار میں ہی رہ گئی تھی جواب وہ لے آیا تھا۔ مختلف شاپرز سے بھری ہوئی۔ ”وا! انکساری سے کہہ رہی تھیں۔“

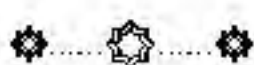
”شکر ہے ماں جی! کوئی فریکچر نہیں ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ ایک ہفتے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو جائیں۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”جگ جگ جیو پیٹا! میں ٹھیک ہوں پھر اپنی جوان بچی کو کیسے چھوڑ کر جاسکتی ہوں۔“ اس لمحے ایک بچی بڑے میں دو کپ چائے لائی۔ ایک کپ نہایت ادب سے اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا اودے کر چلی گئی۔

کافی دنوں بعد چائے کی وہ مہک آئی تھی جس کو وہ ڈھونڈ رہا تھا نہ چاہنے کے باوجود اس نے بے اختیار کپ بچی سے لیا اور لبوں سے لگا لیا۔

وہی کشیدہ ذائقہ تھا۔ ایک کے بعد ایک گھونٹ وہ پیتا چلا گیا کسی نہ بدے کی مانند۔ ”وا! اکا کپ ہاتھ میں تھا اور اس نے کپ خالی کر دیا تھا۔ طمانیت آمیز تسکین رگ رگ میں مانی چلی گئی۔“ وہ اُسے بھرے ہوئے کپ پر نگاہ پڑی تو وہ حواسوں میں پلٹا اور سر منہ ہاتھ کھڑا ہوا۔

”ماں جی! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آپ ان دواؤں کے ساتھ فروٹ اور جوس ضرور لیجئے گا۔ میں کل آؤں گا آپ کی طبیعت معلوم کرنے۔“ پردے کی لوٹ سے جھانکتی نگاہوں میں بے یقینی و تحس نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ رات اس کے لیے بہت طویل و بھاری تھی۔ ”وا! باسکٹ میں سے شاپر نکال کر اس کا لایا ہوا سامان دیکھ رہی تھیں۔ فروٹ جوس کے ڈبے انڈے، مکھن بریڈ، جیلی ڈرائی فروٹس، سکس بے حساب سامان تھا۔“ وہ اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلا بے ملا رہی تھیں۔ اس کے خاموش بستے آنسوؤں سے بے خبر جو اندر ہی اندر رسک رہی تھی۔



ڈرائیو ر سے لیٹر پورٹ چھوڑ گیا تھا۔ کراچی پہنچ کر وہ سیدھی یہاں چلی آئی تھی۔ ”وا! اسے اس نے قرآن پاک پڑھا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں قائم یہ کچی بستی اتنے سال گزرنے کے باوجود ایسی تھی۔ نہ یہاں کے حالات بدلے تھے نہ یہاں کے مکینوں کے دل۔۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے کچے پکے گھروں میں رہنے والے۔ یہاں کے لوگوں کے دل بڑے کشادہ و شفاف تھے۔“ وہ اکی کوئی اولاد نہ تھی چند سال پہلے وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ میاں ان کے دوکانیں چھوڑ گئے تھے جن کے کرائے سے اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ اپنی زندگی انہوں نے شروع سے بچوں کو سپارہ قرآن پاک پڑھانے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ کوئی اولاد نہ ہونے کے باوجود ان کا آنگن بچوں سے بھر رہا تھا۔ ان کے پاس نہ صرف اس محلے کے بلکہ ان کی وضع داری و نیک نامی دیکھ کر اس پاس کے بنگلوں کے بچے بھی درس قرآن لینے آتے تھے

”وا! توجہ سے اس کی داستان سنی تھی اور کچھ عرصے صبر کرنے کی تلقین کی تھی۔ آج پورے دو ہفتے بعد اس نے باسٹ کو دیکھا تھا۔ وہ اسے بہت مختلف و کمزور محسوس ہوا تھا۔ وجہ یہ چہرے پر کچھ کھونے کا احساس تھا۔ منظر اب و امتنا راس کی چال سے عیاں تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ساری رات مختلف سوالوں میں بسر کی۔

وہ دوسرے دن بھی حاضر تھا۔ بہت سارے شاپرز کے ہمراہ۔ ”وا! سختی سے منع کر دیا کہ انہیں یہ سب پسند نہیں۔“

اس دن وہ دو کپ چائے کے پی کر گیا۔ ہاتھ میں ٹافیوں کا کلیئس کے پیکٹ لیے۔ ”وا! کو بتایا کہ وہ ان کے شاگردوں کے لیے لایا ہے۔“ وہ اوزر دیتی چیک اپ کے لیے اسپتال لے کر گیا۔ ”وا! تو اس کی ٹھنی میں تھیں ہی پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کو بھی وہ گرویدہ بنا چکا تھا۔ اس کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔“ وہ اسے منع کرنے کے باوجود ہاتھ میں کچھ نہ کچھ اٹھائے چلا آتا جن میں سرفہرست بچوں کی چیزیں ہوتیں اور جانے سے قبل وہ ان کو کار میں ایک راؤنڈ سیر ضرور کراتا۔ نتیجتاً بچے اس کے آنے کی دعائیں مانگتے اور کار کا ہارن سننے ہی بھاگتے۔ وریشا کو کچھ نہیں آ رہی تھی اس کی حد سے بڑھتی بے تکلفی کا مقصد کیا تھا اور وہ کیا یہاں منہ کو لے آیا تھا؟ اگر لے آیا تھا تو وہ اسے اتنے گھٹنوں تک کس طرح آزاد چھوڑ رہی ہے۔ اس کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بڑھتے سوالوں کی پورش پھیل رہی تھی۔ باسٹ سے اس کا سامنا ابھی تک نہ ہوا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں باورچی خانے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

اس دوران اتنی بے تکلفی بڑھی تھی کہ وہ اکثر کھانا بھی وہاں لگانے لگا تھا۔

”وا! ایک بات کہوں؟“ وہ ان کی چوٹی باندھتی ہوئی بخجیدگی سے بولی۔

”اجازت کی کیا ضرورت ہے ضرور کہو بیٹی۔۔۔۔۔“ وہ شفقت سے کوپا ہوئیں۔

”وہ۔۔۔۔۔ باسٹ صاحب۔۔۔۔۔ بہت آنے لگے ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میری یہاں موجودگی۔۔۔۔۔ لوگ کیا باتیں نہیں بنائیں گے؟“ وہ جھمکنے ہوئے مدعا بیان کر رہی تھی۔ یہ گھر اس کا نہیں تھا۔ وہ خود یہاں آئی تھی اور وہ کس طرح انہیں پابند کر سکتی تھی کسی کو بلانے پر۔

”میں جانتی ہوں بیٹی! تم جو کتنا چاہ رہی ہو میں سمجھتی ہوں۔ دیکھو بیٹی! اول تو وہ لڑکا بہت شریف و نیک ہے۔ میں نے کبھی بھی اس کی نظروں کو ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیکھا۔ میرے سامنے بھی نگاہیں جھکا کر بیٹھا رہتا ہے اور ہی لوگوں کی بات تو لوگ خود اسے پسند کرتے ہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ یہ اطلاع اس کے لیے حیرت انگیز تھی۔

”وہ لڑکا فرشتہ ثابت ہوا ہے ہمارے لیے۔ ایسے مبارک قدم ہیں اس بستی میں پڑتے ہی کوپا سب کچھ سنوٹا جا رہا ہے۔“ وہ اس کی تعریفوں کی پوٹلی کھول چکی تھیں۔ ان کی زبان روئی دواں تھی۔

”ہستی کے لوگوں کے لیے مسجد تعمیر کروا رہا ہے۔“

”مسجد یہاں پہلے سے موجود ہے پھر۔۔۔۔۔“

”بہت چھوٹی مسجد ہے۔ رمضان شریف میں اوکوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ کئی بے روزگاروں کو ملازمتیں دلوئی ہیں۔ پانی کا مسئلہ حل کر لیا ہے اور یہ بستی بھی کچھ عرصے بعد لیز کروا دے گا۔۔۔۔۔ کہہ رہا تھا اعلیٰ حکام سے بات چل رہی ہے۔ جلد ہی مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ وہ اسرار تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیا پلٹ کس طرح ہوئی؟ اپنی ذات کے لیے جینے مرنے والا شخص جس کے نزدیک صرف اس کی خوشیاں و خواہش حاصل زیست تھیں جو دل توڑنے میں مہارت کے درجے پر فائز تھا جس نے کس طرح ذلیل و خوار کر کے اسے وہاں سے نکالا تھا۔۔۔۔۔ آج کس طرح کس کی خاطر یہ سب کر رہا تھا جو اس کا شیوہ نہ تھا۔

”میں نے کہا بھی بیٹا! تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ یہ ہم غریبوں کا دلہنہ ہے۔ رہنے دو جہاں سالوں سے کچھ نہیں بدلا وہ تم کیوں کر بدل پاؤ گے؟“ وہ اسے جاری تھیں۔

”وہ بولا ماں جی میں دعاؤں کا متنی ہوں۔ نیکیوں کا طلب گار ہوں میں یہ سب اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے کسی کی تلاش ہے۔ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ آپ دعا کریں میں اسے پالوں گا۔ میری کوئی چھوٹی سی نیکی سائل مراد تک پہنچا دے گی۔“ وریشا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ بولی۔

”بوا! آپ نے پوچھا نہیں ایسی کیا چیز ہے جس کی انہیں تلاش ہے؟“ اس کے اندر ایک انجانی سی کھلبلی مچی تھی۔

”دل تو بہت چاہا پوچھوں مگر حجاب اڑے آ گیا۔ یقیناً وہ کوئی خاص اور ایسی چیز ہوگی جو یہاں نہ ملتی ہو ورنہ وہ اتنے امیر ہیں کہ نہنگی سے نہنگی چیز خریدنے میں بھی تردد نہ کریں۔“

”ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جس کا نعم البدل نہ ہو؟ کیا باسط اور منرہ کے درمیان کچھ ہوا ہے؟ کیا منرہ روٹھ کر کہیں چلی گئی ہے جس کی تلاش میں وہ سرگرداں نیکیاں کر رہے ہیں۔ دعاؤں سمیٹ رہے ہیں..... دل میں کسی خوش فہمی کو جگہ مت دو وریشا۔ تم کتنی نادان، کتنی کوڑھ مغز ہو۔ ہر بار اس شخص کی زیادتیاں بھلا کر اس سے اچھائی کی توقع کرتی ہو..... وہ تمہاری تلاش میں نہیں ہے۔ اسے تمہاری جستجو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسی وقت تمہاری یہاں موجودگی محسوس کر لیتا جس طرح تم نے اس کے قدموں کی آہٹوں سے ٹلبوس کی مہک سے اسے بچھا رکھا تھا۔“ وہ خود سے الجھ رہی تھی۔ بوا کے لب مسلسل حرکت میں تھے۔

”میں سوچ رہی ہوں بیٹی! باسط میاں سے تمہارے خاوند کا پتہ کرواؤں۔ کیا نام ہے تمہارے خاوند کا..... کبھی تم نے بتایا نہیں.....؟“

”چھوڑیں بوا! کیوں کسی کو پریشان کرتی ہیں۔ ان کو آنا ہوگا تو خود ہی آ جائیں گے۔“ وریشا نے کول مول جواب دیا۔

”معاف کرو بیٹی! اگر تمہارا خاوند غلط پتہ آدھی غلطی تمہاری بھی ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی بوا! میں نے صبر کیا۔ برداشت کیا میری غلطی ہے؟“ نہ معلوم کس احساس تلے وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”ہاں۔ جب وہ دوسری عورت کے متعلق باتیں کرتا تھا تو تم نے کیوں اسے روکا نہیں؟ کیوں خاموشی سے راستہ صاف کرتی چلی گئیں؟“

”ہم زبردستی کسی کو محبت کرنے پر مجبور کس طرح کر سکتے ہیں؟“

”وہ کوئی غیر نہیں۔ تمہارا خاوند ہے۔ میاں بیوی کے درمیان غیریت نہیں ہوتی۔ وہ پیچھے ہٹا تھا۔ تم آگے بڑھ جاتیں توڑ دیتیں اپنے جھوٹے غرور کو۔ مرد ہمیشہ سے خوب صورتی و حسن کا اسیر رہا ہے۔ اگر تم ایسی بے وقوفی نہ کرتیں تو وہ کب کا اس عورت کو بھول کر تمہارا بن چکا ہوتا۔“ بوا اب اسے سبق پڑھا رہی تھیں۔

”اس نے مجھے گھر سے نکالا، گالی دی میرے کردار پر شک کیا۔ یہ سب میں کس طرح بھول سکتی ہوں بوا۔ ایک عورت کا اصل زیور اس کا کردار ہوتا ہے۔“ وہ بے اختیار رونے لگی۔ بوا نے اسے سینے سے لگایا، سمجھایا یا رکھا پھر بولیں۔

”میں جانتی ہوں یہ سب برداشت کرنا بہت مشکل ہے مگر میری بیٹی! ایسا سوچنے کا بھی تم نے ہی موقع دیا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا مگر میرا دل کہتا ہے وہ پلٹ کر ضرور آئے گا اور اس کی سزا یہ ہوگی کہ تم اسے معاف کر دینا۔ اس کا خمیر اسے بنا حیات تمہارے آگے نگاہ نہ اٹھانے دے گا۔“

سپارہ پڑھنے والے بچے سلام کرتے ہوئے اندر آگئے تھے جن کے لیے اس نے پہلے محن میں درمی بچھا دی تھی۔ وہ چٹلیں ایک طرف اتار کر درمی پر بیٹھ گئے تھے۔ پیچھے وہ چلا آیا۔ بہت سارے غبارے اور چاکلیٹس لیے ہوئے۔ اس نے بچوں میں بانیاں اور غبارے تقسیم کرنا شروع کر دیے تھے۔ بچوں کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی اور وہ پردے کی لوٹ سے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی جہاں بے سکونی و منظر ارضیت ہو کر رہ گئے تھے۔ بوا اسے اندر لے گئی تھیں پھر لائے قدموں ہی واپس آئی تھیں۔

”شامی کباب تیار ہو گئے؟ باسط میاں کہہ رہے ہیں بڑی لذیذ خوشبو آ رہی ہے۔“ بوا اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”ہاں تیار ہیں۔“ کباب پلٹتے ہوئے بولی۔

”تم اتنے میں رائے بنا لو میں پرانے بناتی ہوں۔“

”وہ پرانے نہیں کھاتے۔ میں بریڈ سینک دیتی ہوں۔“ اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔ چورنگا ہوں سے بوا کی جانب دیکھا تو وہ اپنے آپ میں گم تھیں۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس دن بھی انہوں نے پرانے نہیں کھلایا تھا۔ جلدی سے تیار کر کے بھیج دو اندر۔ یہ میرے نصیب ہیں۔ پہلے تم جیسی لڑکی نے میری کتیا کو نکل بنادیا۔ اب باسط میاں نے اتنی عزت دے کر سرخرو کر دیا ہے۔ محلے میں سب مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“ شدت جذبات سے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ وریشا نے بڑی عقیدت سے ان کے آنسو صاف کیے تھے۔

باسط بڑی حیران کن نگاہوں سے اپنے آگے رکھے اس ٹرے کو دیکھ رہا تھا جس میں پلیٹوں کے اندر کباب، سلاؤس، چپس اور کچپ ایک مخصوص انداز سے رکھے تھے اور یہ انداز ان مخصوص ہاتھوں کا تھا جو کھو گئے تھے۔ بوا اسے کھانے کی تلقین کر کے محن میں بچوں کا سبق سننے چلی گئی تھیں۔ وہ کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ بوا کی بیٹی اور وریشا کی ننچر یکساں لگتی ہے۔ خاموش رہنا، گھر چمکا کر رکھنا، کھانے لذیذ بنانا، اسے یہاں آتے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ وہ اس چھوٹے سے گھر کی جانب کھنچا چلا آتا تھا۔ یہاں آ کر اس کے مضطرب دل کو طمانیت ملتی تھی۔ کھویا ہوا قرار ملنے لگتا تھا۔ دل و دماغ پر چھائی وہ مانوس سی خوشبو ان کی پکی درود پواروں سے پھونتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا دل کہتا وہ یہیں کہیں ہے۔ اس کی خوشبو اس کی خاموشی اسے صدائیں دیتی تھیں اور وہ سب بھول بھال کر کشاں کشاں یہاں بھاگا چلا آتا اور سب بھول جاتا تھا۔

بوا کی سادگی و صروت سے بھرپور باتیں اسے اچھی لگتیں پڑھنے والے بچوں سے وہ خاصی حد تک فری ہو گیا تھا۔ بچوں کے ساتھ شرارتیں کر کے وہ خود میں جینے کی امنگ پیدا کرتا تھا۔ ابھی صبح اس سے سیل فون لے کر گیا ہوا تھا۔ وہ اس کے کمرے سے آم کے پیڑ پر آنے والے پرندوں کی تصویر کھینچتا تو کبھی دیوار پھاندتی ملی اس کے کمرے کی زد میں آتی تھی۔

وریشا کی تلاش میں ناکامی کے بعد بھابی نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرے مجبور بے بس لوگوں اور معصوم بچوں کی دعاؤں لے کیوں کہ نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی دعاؤں کبھی نہ کبھی ضرور قبولیت کا درجہ پاتی ہیں تب سے اس نے ایسے بہت سے فلاں جو ہود کے کام شروع کر دیے تھے۔

”انکل بہت ساری تصویریں لے کر آیا ہوں۔“ چھ سالہ صبح خوشی خوشی اندر آ کر اس سے کویا ہوا تھا۔

”اچھا..... بیڑے باہر دے کر آؤ پھر تصویریں دیکھتے ہیں۔“ وہ سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر ٹرے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ صبح ٹرے لے گیا۔ وہ تصویریں دیکھنے لگا۔ آڑی تر چھی تصویریں محن میں بیٹھے بچے نمایاں تھے۔ کچھ تصویروں میں بوا بھی موجود تھیں پھر ایک تصویر پر اس کی نگاہیں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت صبح اندر داخل ہوا تو وہ پوچھنے لگا۔

”بیٹا اب یہ..... کیوں ہیں؟“ اس نے موبائل کی اسکرین پر انگلی رکھ کر کہا۔

”یہ باجی ہیں۔ میں نے چھپ کر یہ تصویر لی ہے۔ یہ آپ کو دیکھ کر پردے میں چھپ جاتی ہیں۔ بوا کو آپ نے دیکھا ہے۔ باجی کو نہیں دیکھا اس لیے۔“ صبح کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ وہیں چاندنی پر سجدے پر گر گیا تھا۔

اس کی نیکیاں رائجاں نہیں گئی تھیں۔ اس رب کریم نے اپنی رحمتوں کی بارش اس پر اس انداز میں کی تھی کہ جلد دعاؤں مقبول ہوئی تھیں۔ صبح اسے اس طرح سجدے میں دیکھ کر سمجھا کہ وہ گر گیا ہے۔ وہ بھاگ کر بوا کو بلا کر لے آیا۔ ہانپتی، کانپتی، ناگہرا کر اندر آئی۔ ان کے پیچھے تمام بچے اور بچوں کے پیچھے خوفزدہ سی اڑی اڑی رنگت والی وریشا تھی۔ وہ سجدے سے اٹھ گیا تھا۔ اشک ندامت اس کی آنکھوں میں تھے۔ بچوں کو بوانے چھٹی دے دی۔ باسط کے شرمسار و نام انداز میں حرف داستان سنی اور فیملے کا اختیار وریشا کے ہاتھ میں دیا تھا۔

کمرے میں گھیر خاموشی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے باسط اسے منانے کے لیے، حکایت دل سنانے کے لیے لفظوں کو ترتیب دے رہا تھا اور وہ گردن جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔

”وریشا! اس نے محبت سے مخمور نگاہیں اس کے صبح چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

”جو ہمارے ساتھ گزرا وہ کبھی نا حیات ہماری زبان پر نہیں آئے گا۔ اس وقت کو ایک ڈراؤنا سپنا سمجھ کر بھول جاؤ۔ میں نے جو تمہارے ساتھ کیا اسے اگر معاف کر سکتی ہو تو کرو..... ورنہ میں ہر سزا بھگتے کو تیار ہوں۔“ وریشا خاموش رہی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”جاننا ہوں۔ میرا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ میں نے بہت کم ظرفی و بے حسی کا ثبوت دیا تھا مگر تم سے دوری اور تمہاری تلاش نے مجھ سے پھر پورا انتقام لیا ہے۔ لمحہ بھر تڑپا ہے۔ تم بے جی کے پاس کیوں نہیں گئیں؟ اگر تقدیر ہمیں اس طرح نہ ملائی تو..... یقین مانوں میں زندہ نہیں رہ پاتا۔“ اس کی نگاہوں میں محبت کی صداقت تھی۔ پھر محبت تو بذات خود ایسا جذبہ ہے جو اپنا آپ منوار کر چھوڑتا ہے۔ وہ اس کے جذباتوں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ اب اس کی چاہت کی چاندنی صرف اس کے لیے تھی۔ ساری خفگی و کمزورت صاف ہو چکی تھی۔ اس کے لبوں پر برسوں بعد وہی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نمودار آئی تھی جس نے اس کے چہرے کو پورے وجود کو منور کر ڈالا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ اب وہ دادی جان کی دعاؤں کے حصار میں آ گئی تھی۔ رونے کے دن گزر گئے تھے۔ اب ہنسنا تھا۔

”میں ہر سزا پانے کو تیار ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو وریشا۔“

اس کی خاموشی اسے متوحش کر رہی تھی۔

”بیٹی! اگر صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو دروازے کھول دیتے ہیں، ٹنگر انہیں کرتے، مان جاؤ، معاف کر دو۔ بھلا معافی سے بڑھ کر اور سزا کیا ہوگی قصوروار کے لیے۔“ بوا اندر آ کر کویا ہوئیں۔

”بوا! آپ میری طرف ہیں یا ان کی طرف؟“

”وہ کہتے ہیں نہ ففٹی ففٹی۔“ بوا کے انداز پر بیٹیوں کے تہقیر کو بخ اٹھے تھے۔